www.kmjeenovels.blogspot.com

شاہراہِ ریشم

رپورتاژ

www.kmjeenovels.blogspot.com

پھڈ یار

"ارے!" لیڈر نے چیخ ماری "وہ دیکھو، وہ!"

سب کی نگاہیں آگے کی طرف اُٹھ گئیں۔ سامنے نہ شاہ تھی، نہ راہ تھی، نہ ریشم تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، سڑک پر چھوٹے بڑے پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، جن سے چینی یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے گُڑ کی بھیلیوں سے چیونٹے۔ چینی ہی چینی۔ چیونٹے ہی چیونٹے۔

ڈرائیور نے فوراً وہیل گیئر لگا لیا۔

جیپ پتھروں کے ڈھیر پر رینگنے لگی۔ سواریاں اُچھلنے لگیں۔ بھٹیاری کی کڑاہی میں دانے بُھننے لگے۔ جیپ کے پیچھے ڈیڑھ دو سو ٹرک ہونکتے، شور مچاتے، ڈولتے ہوئے، پتھروں پر لُڑھکنے لگے۔

دائیں بائیں، دونوں جانب، سنگلاخ چٹانوں کی اُونچی اُونچی دیواریں کھڑی تھیں۔ نہ درخت، نہ جھاڑی، نہ ٹہنی، نہ پتّا۔ سر پر سورج بے رحمی سے چمک رہا تھا۔ سڑک پر سائے کا نام و نشان نہ تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، نہ کوئی گاؤں نظر آ رہا تھا، نہ گھر۔

جیپ رینگتی رہی۔ لُڑھکتی رہی۔

ہر چند میل کے بعد چینی کیمپ آجاتا۔ دس بارہ دم بُخت قسم کے خیمے، جن کے قریب فرنٹیئر فورس کا سیکیورٹی حوالدار بندوق اُٹھائے، گردن گرائے، مونچھ لٹکائے کھڑا تھا۔

دور دُور یہ سنسان، ویران، چٹیل چٹانوں سے گرمی کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ پیٹرول کی بُو ساری وادی میں پھیلی ہوئی تھی۔ نیچے دُور، نہ جانے کہاں دریا بہہ رہا تھا۔ مکھیوں کا چھتا بھن بھنا

www.kmjeenovels.blogspot.com

رہا تھا۔

صدیاں بیت گئیں۔ جیپ کا چھکڑا رینگتا رہا۔ ٹرکوں کا قافلہ لڑھکتا رہا۔ سورج گردش کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس نے ہمارے سروں پر جھنڈا گاڑ لیا۔

دفعتہً ایک دھچکا لگا اور جیپ رُک گئی!

سامنے پتھروں کے ڈھیر پر چینیوں کی ایک قطار کھڑی تھی۔ ہاتھ اُٹھا رکھے تھے سب یک زبان ہو کر چلا رہے تھے "چہ ن۔ چہ ن۔ چن چن۔ چیئیں چیئیں۔ بلاشٹن بلاشٹن۔"

"یہ کیا تماشا ہے؟" لیڈر غرّایا۔

"چینی تماشا" وٹ بولا۔

"بلاشٹن کا مطلب؟" انجینئر نے پوچھا۔

"ٹن کا مطلب تو واضح ہے۔ بلاشٹن کا پتا نہیں۔"

"یہ کیا وٹ جھاڑنے کا موقع ہے؟" لیڈر نے منھ سے جھاگ نکالتے ہوئے کہا۔

"وٹ اور روٹھ میں کچھ زیادہ فرق نہیں" داستان گو بولا۔ شاعر نے قہقہہ مارا۔

اتنے میں چینی کیمپ سے ملحق خیمے سے حوالدار بندوق اُٹھائے آ گیا۔

"کیا بات ہے، حوالدار؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"صاحب، آگے بلاسٹنگ ہو رہا ہے۔ ٹریفک بند ہے۔ بلاسٹنگ ہو گا تو اُدھر سے پتھر گرے گا۔ سواری لوگ نیچے اُتر آئیں۔ ٹرکوں تلے "کور" لے لیں۔ جلدی جلدی، صاحب، جلدی۔"

"کب تک ٹریفک بند رہے گا، خان؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"دو دن" حوالدار نے مونچھ پر تاؤ دیا۔

"دو دن؟" سب نے حیرت سے دُہرایا۔

"ہم کب تک ٹرکوں تلے کور لیے پڑے رہیں گے؟" لیڈر غصے سے غرّایا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"جب تک ہمارا مُربّا نہ بن جائے۔" وِٹ ہنسا۔

دڑا... ٹرا... ڈوم... ۔ ایک دھماکا ہُوا۔ پہاڑوں نے دُہرا کر اُسے خوفناک بنا دیا۔ ڈر کر سب نے جیپ سے چھلانگیں لگا دیں، اور کور لینے کے لیے ٹرکوں کی طرف بھاگے۔

ہم کُل سات تھے: لیڈر، انجینئر، داستان گو، شاعر، وِٹ، ڈرائیور اور میں۔

ہماری مُشکل یہ ہے کہ ساتوں بہت سیانے ہیں، ضرورت سے زیادہ سیانے۔ ہمارا ہر رُکن مذہب، سیاست، ادب، دفتریات، سائنس، فلسفہ غرض ہر موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ اس لیے دُوسروں کو سمجھانا اور راہِ راست پر لانا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتا ہے۔ اور چونکہ حرفِ آخر ہے، اس لیے دُوسروں کی بات سُننا یا اسے سمجھنا اس کی شان کے منافی ہے۔

دُنیاداری میں ہم سب الیسپ کے سیانے کوّے کی طرح پانی کی سطح اپنی چونچ تک اُبھارنے کے لیے مرتبان میں پتّھر پھینکتے رہتے ہیں۔

ہم ساتوں رنگ رنگ کے منکے ہیں۔ کوئی چوکور، کوئی گول، کوئی مخروطی۔ جو بدقسمتی سے ایک لڑی میں پروے گئے ہیں۔ اس لڑی کا نام ہے "چھڈ یار"۔

چھڈ یار ایک چوکڑی ہے جو اتّفاقاً وجود میں آئی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہُوا کہ ایک روز اَن جانے میں ہم سب پر ایک دیانت بھرا لمحہ نازل ہو گیا۔ اس کے تحت ہم سب نے محسوس کیا کہ سیانف اور معتبری کا بوجھ جملہ بوجھوں سے زیادہ بوجھل ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم ہر سال آٹھ دس دن کے لیے تمام بوجھوں اور بندھنوں پر "چھڈ یار" کہہ کر باہر نکل جایا کریں، اور چھڈ یارہ منائیں۔ چھڈ یار کے بنیادی قوانین بظاہر بڑے آسان ہیں۔ پر ہیں بے حد مشکل:

۱۔ کہ ہر سال دس بارہ دنوں کے لیے چھڈ یار منانا لازم ہو گا۔

۲۔ کہ باہر جاتے وقت اپنے اپنے سیانے معزّز عہدے دار کو گھر چھوڑ کر جانا ضروری ہے۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

۳۔ کہ باہر جانے سے پہلے ہر کوئی اپنے اندر کے دم بخت مظلوم بچّے کو باہر نکالے گا۔ اس کا منھ دھوئے گا، چومے گا، پچکارے گا، پھر کندھے پر بٹھا کر ساتھ لے جائے گا۔

۴۔ کہ اس آؤٹنگ کے دوران کوئی رکن عقل کی بات کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، اور نہ دوسروں کو عقل سکھانے کی عیاشی کا سزاوار ہوگا۔ البتہ بحث کرنے پر کوئی پابندی نہیں، کیونکہ بحث ایک معصوم اور بے ضرر وقت کٹی ہے۔ بحث سے کبھی کوئی قائل نہیں ہوا۔ بحث نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔

چھڑیار کے سات بنیادی رکن ہیں۔ سب سے پہلے لیڈر ہے، جس کی جملہ خوبیوں کی وجہ سے اسے متفقہ طور پر لائف لیڈر منتخب کیا گیا۔ پہلی خوبی یہ ہے کہ وہ سیانف اور معتبری کے بوجھ سے ہمیشہ کے لیے ازلی طور پر آزاد ہے۔ اس کے اندر کا بچّہ ہمہ وقت اس کے کندھے پر سوار رہتا ہے۔ پہاڑوں پر پہنچ کر اس کے اندر کا شرپا بیدار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا جی چاہتا ہے کہ کسی ہلیری کو کندھوں پر اٹھا کر چوٹی پر گاڑ سکے، جس طرح ہمارے تمام شرپے کیا کرتے ہیں۔ لیڈر کا صرف ایک مطالبہ ہے کہ اسے چودھری کہہ کر بلایا جائے۔ مطالبہ صرف کہہ کر بلانے کا ہے، سمجھنے کا نہیں۔ پکارنے کے بعد چاہے آپ اسے اپنے کام میں لگائے رکھیں۔ وہ سودا لائے گا، آپ کے لیے کھانا پکائے گا، برتن دھوئے گا، چائے پکائے گا، اور ضرورت پڑے تو آپ کے پاؤں دبائے گا۔ لیکن خبردار! اسے مسلسل چودھری جی کہنا ضروری ہوگا ورنہ نتائج کی ذمّے داری خود آپ پر ہوگی۔ اس لحاظ سے لیڈر کی حیثیت خالص مردِ جیسی ہے۔

ہمارا دوسرا رکن شاعر ہے۔ شاعر کا زاویۂ نگاہ سائنسی ہے۔ نثر نگار کی طرح سوچتا ہے۔ غیر شاعرانہ طبیعت کا مالک ہے، لیکن شعر کہتا ہے۔ اچھے اور پُرمعنی شعر۔ شاعر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دفتر کو مندر کا رتبہ دے رکھا ہے۔ شاعر کے اندر کا بچّہ طویل دفتری تپسیا کے باوجود ابھی تک زندہ ہے۔ اس کی ذمّے داری شاعر پر نہیں، بچّے پر ہے۔ وہ اس قدر جاندار تھا کہ کوشش کے باوجود نہیں مر سکا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

ہمارا تیسرا رکن وٹ ہے ـــ اللہ نہ کرے کہ آپ کو اس کے ماتحت کام کرنا پڑے۔ اگر وہ آپ کا ماتحت بن جائے تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہو گی۔ حاکم کی حیثیت سے وہ مسلسل تیوری ہے۔ خاوند کی حیثیت سے چُون وچرا ہے۔ لیکن ساتھی کی حیثیت سے باغ و بہار شخصیت ہے۔ مسلسل مفرّح مسکراہٹ، خدمت گار، مٹھاس کا ایسا مرتبان جس سے پھوار اُڑتی رہتی ہے۔ مزاح اور حاضر جوابی کی بنا پر اُسے اعلیٰ درجے کا مزاح نگار ہونا چاہیے تھا۔ کیوں مُنھ نہ بانی رہ گیا، یہ بھید آج تک نہیں کھُلا۔ بہر طور اُس کی اس خصوصیت کی وجہ سے ہم نے اُس کا نام وٹ رکھ دیا ہے۔

ہمارا چوتھا رُکن داستان گو ہے ـــ داستان گو بڑا گُنی آدمی ہے۔ بڑا معروف، جانا پہچانا۔ مگر طبیعت کا برہمن ہے۔ ذات پات کا بڑا قائل اُونچا بیٹھ کر بات کرتا ہے۔ لیکن بات کا دھنی ہے۔ باتوں کا ایسا جال پھیلاتا ہے کہ سُننے والوں میں خود اسیر ہونے کی خواہش چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ ذات کا پٹھان ہے۔ اندر سے خالص اور اُوپر سے "کاٹھا"۔

ہمارا پانچواں رُکن انجینئر ہے ـــ انجینئر تضادات کی کھچڑی ہے۔ ایک پلّو میں ایمان بندھا ہے، دُوسرے میں کُفر۔ ایک جیب میں فنون کا شوق، دوسری میں مشینوں کی پرستاری۔ اعمال کٹّر مسلمان کے۔ خیالات کٹّر مادّہ پرست کے۔ کندھے پہ تصوّف کا جھولا۔ ماتھے پہ جدّت کا ٹیکا۔

ہمارا چھٹا رُکن فوک لوریا ہے، جو اعزازی طور پر ڈرائیور کا کام کرتا ہے۔ اسے مناظر سے دلچسپی نہیں، لوگوں سے ہے۔ لوگوں سے بھی نہیں، اُن کی رہت بہت سے ہے۔ وہ ایک ایسا بادام ہے جس میں دو مغز ہیں۔ ایک صوفی فلاسفر ہے۔ دُوسرا شُدھ انگریز۔ جب وہ ایوولیوشن (ارتقا) کی بات چھیڑ دے تو پھر آپ کا اللہ حافظ ہے۔ اور وہ ہمیشہ تاک میں بیٹھا رہتا ہے کہ کب موقع ملے اور ایوولیوشن کی بات چھیڑے۔

آخر میں مَیں ہوں ـــ میں جو "میں میں" کے سوا کچھ بھی نہیں۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

مئی ۱۹۷۷ء میں چھڈ یار کا اتفاقیہ اکٹھ ہُوا۔ ان دنوں سیاسی صورتِ حال سخت پریشان کُن تھی ۔ ہم سب سیاست ہی کو رہے ہیں۔ سیاست کو بالکل نہیں سمجھتے۔ لیکن سمجھتے ہیں کہ خوب سمجھتے ہیں۔ لہٰذا سیاست پہ بات کرنا ہمارے لیے بہت بڑی عیاشی ہے۔

ہمارا دُوسرا وصف یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو کسی اِزم سے وابستگی نہیں۔ ہم سب کو ایک فکر دامن گیر رہتا ہے کہ امن وامان قائم رہے۔ اگر ہمیں یہ یقین دلایا جائے کہ امنِ عامّہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو سیاسی لڑائیاں، جھگڑے، فساد ہوتے ہیں تو بسم اللہ ہوں، ہم صورتِ حال پر کتابی بحثیں کر کے دل خوش کر لیتے ہیں۔

ان دنوں ملک کی سیاسی صورتِ حال بڑی پریشان کُن تھی۔ سیاسی لیڈروں کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مذاکرات میں باتیں ہوتی ہیں "سب اچھا، سب اچھا" کی رپورٹیں ہوتی ہیں۔ نہ نتیجہ ہوتا ہے نہ فیصلہ۔

لوگ گھبرا کر سڑکوں پر نکل آئے تھے، کیونکہ کسی ستم ظریف نے قوم کو یاد دلایا تھا کہ ہمارا ایک نصب العین تھا۔ ایک منزل تھی۔ ایک سمت تھی۔ ایک رُخ تھا۔

اس روز سیاسی صورتِ حال پہ ہماری بہت بحث ہوئی۔ اتنی بحث ہوئی کہ ایک نے اُکتا کر کہا "چھڈ یار۔"

دوسرا بولا "ہاں، چھڈ یار۔"

چھڈ یار کی یہ اتفاقیہ تحریک زور پکڑتی گئی حتیٰ کہ سب چلّانے لگے "چھڈ یار، چھڈ یار۔"

ایک بولا "خبردار! یہ فرار ہے۔"

دُوسرا ہنسا "فرار سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ آنکھیں بند کر لو اور خود کو محفوظ کر لو۔"

تیسرے نے کہا "خوش فہمی ایک دھوکا ہے۔"

چوتھے نے کہا "خوشی کیا ہے؟ خوش فہمی۔"

پانچویں نے کہا "چھڈ یار۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"چھڈ یار، چھڈ یار" چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔
یوں اتفاق رائے سے چھڈ یار کا فیصلہ ہوگیا۔

اب سوال یہ تھا کہ جائیں تو جائیں کہاں؟ یہ سوال بہت ٹیڑھا سوال ہے۔ جب بھی یہ سوال اُٹھتا ہے تو چھڈ یار کے ارکان مچھلی منڈی کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تو تو میں میں ہوتی ہے۔ ہمکا تمکا ہوتا ہے۔ جوتم پیزار ہوتی ہے منھ زبانی۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب دانشور ہیں۔ وہ بھی اعلیٰ درجے کے۔ اس لیے آج تک ہم کسی بات پر متفق نہیں ہو سکے۔

ہمارا لیڈر پہاڑوں کے حق میں ہے۔ وہ پہاڑوں میں پیدا ہوا۔ وہیں پل کر جوان ہوا۔ اُس میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ پہاڑ پر یوں چڑھ جاتا ہے جیسے بکری۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اپنی اس عظیم صلاحیت کی نمائش کرے۔ نمائش تبھی ہو سکتی ہے جب ناظرین موجود ہوں۔ چھڈ یار اسے صرف اس لیے محبوب ہے کہ اس کے لیے ناظرین مہیا کرتا ہے۔ لیکن اس کے لیے پہاڑ پر جانا از بس ضروری ہے۔ اس لیے وہ پہاڑوں پہ جانے کے حق میں ہے۔ کہتا ہے، ایک نک سے پہاڑ نکال دو تو وہ کوفت بن جاتی ہے۔ لہٰذا میدانی علاقے میں چلنا بے معنی ہے۔

لوک رسیا سیاحت کا دیوانہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پہاڑ پتھر ہیں۔ پتھروں سے کیا دلچسپی۔ اصل چیز تو لوگ ہیں۔ لوگوں کو دیکھو۔ ان سے باتیں کرو۔ انھیں سمجھو۔ انجینئر بہت گھوما پھرا آدمی ہے۔ اس نے پاکستان کے دُور دراز علاقوں کو دیکھا ہے۔ وہ سب تفصیلات جانتا ہے۔ لہٰذا ہر بات کے بیچ بول اُٹھتا ہے: ادھر جاؤ گے تو یہ ہوگا۔ اُدھر جاؤ گے تو وہ ہوگا۔

لیڈر کو اس بات پر غصہ آتا ہے کہ وہ کیوں جانتا ہے۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ جاننے کا حق صرف لیڈر کو حاصل ہے۔ اگر وہ نہیں جانتا تو بھی جانتا ہے۔ کیونکہ لیڈر ہے۔
لوک رسیا کہتا ہے "چلو، صحرا میں چلو۔ صحرا کی کیا بات ہے۔ وہاں ایک عجیب عالم

www.kmjeenovels.blogspot.com

ہوتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ کیا صبح ہوتی ہے! کیا شام ہوتی ہے! سبحان اللہ!"

"خاک ہوتی ہے" لیڈر غراتا ہے "دھول اُڑتی ہے۔"

شاعر کے پاس ایک ایٹم قسم کا قہقہہ ہے۔ ایٹم بم حدت اور ہوا کے تھپیڑے مارتا ہے۔ شاعر کا قہقہہ آواز اور تمسخر کے تھپیڑے سے مارتا ہے۔ شاعر جب قتل کرنا چاہے، اس پر قہقہے کا بم چلا دیتا ہے۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ طبعاً وہ طرف دار نہیں۔ لہٰذا کبھی اس کو مارا کبھی اُس کو۔ کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا۔ اس کی خوشی صرف اس بات پر ہے کہ محفل میں لاشے نظر آئیں۔

داستان گو تماش بینی کا رسیا ہے۔ لوگ جھگڑیں تو اُسے خوشی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ جھگڑا نمٹانے کے بجائے اسے ہوا دیتا ہے۔

وٹ جھگڑے میں پھول پتیاں سجاتا رہتا ہے اور ریلیف مہیا کرتا ہے۔ مقصد یہ نہیں کہ قہقہہ لگے اور جھگڑا ختم ہو، بلکہ یہ کہ پارٹیاں تازہ دم ہو کر جھگڑیں۔

رہا میں، تو آپ سے کیا پردہ۔ مجھے ان لوگوں پر بہت غصہ آتا ہے جو دوسروں کے جھگڑوں میں ملوث ہونے سے ہچکچاتے ہیں۔

خیر صاحب، اس بات پر ہمارا بہت جھگڑا ہوا کہ جائیں تو جائیں کہاں؟

ایک نے کہا "نیلم وادی میں جائیں۔"

دوسرے نے کہا "اتنا وقت نہیں۔"

تیسرے نے کہا "بابوسر چلیں"۔

چوتھا بولا "راستہ کھلا نہیں۔"

پانچواں بولا "چولستان سہی۔"

چھٹا بولا "وہاں لیڈر نہیں جائے گا۔ کیونکہ لیڈر صرف وہاں جانا پسند کرتا ہے جہاں ساگ ہو۔"

یہ ساگ کیا چیز ہے؟ اس کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ چھڑیا رہیں ساگ بہت

www.kmjeenovels.blogspot.com

اہم ہے۔ بات، بات پر ساگ کی بات کرنا بے حد ضروری ہے۔ بات کریں، ضرور کریں، بار بار کریں۔ لیکن اس کی وضاحت کرنے کی اجازت نہیں۔ ہر رُکن کو اختیار حاصل ہے کہ ساگ کو جو چاہے سمجھے۔

ایک رکن بولا "اب کی بار کافرستان چلو۔"

دوسرا بولا "وہاں جانے کا تب مزا ہے جب جشن کے دن ہوں۔"

تیسرا بولا "یہ سب باتیں چھڈ یار کی سپرٹ کے منافی ہیں۔ مقصد چھڈ یار ہے۔ کوئی مقام نہیں، منزل نہیں، جگہ نہیں، قیام نہیں۔ کسی ایسی سمت چل دو جہاں چھڈ یار کی جنت ہو۔ کوئی خبر نہ ملے۔ نہ ملک کی نہ سیاست کی، نہ ہیرا پھیری کی، نہ گھر کی، نہ دفتر کی۔"

"شاہراہِ ریشم" ایک چلایا۔

"پچھلے سال ہمارے دو ارکان کو شاہراہِ ریشم پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ پنڈی سے تھاکوٹ تک، ۱۲ میل لمبی سڑک پر، ریشم ہی ریشم بچھا ہوا تھا۔ ہزارہ کے پہاڑوں کے بیچوں بیچ ریشم کا اتنا چوڑا تھان بچھا دیکھ کر حیرت سے آنکھیں اُبل آئیں، اور اُبل کر سڑک پر مرکوز ہو گئیں۔ پھر نہ پہاڑ رہے، نہ سبزہ زار رہے، نہ وادیاں، نہ چوٹیاں، نہ ساگ، نہ پات۔ ساری کائنات ریشمی سڑک کی اوٹ میں آ گئی۔ سب کچھ معدوم ہو گیا۔ صرف سڑک ہی سڑک رہ گئی۔

"میں نہیں مانتا" لوک چلایا "کہ ایسی سڑک بھی ہو سکتی ہے جو سر اُٹھا کر دیکھنے نہ دے۔"

"ہو سکتی ہے۔ ہے۔ ہے۔"

"کیا پاکستان میں ہے، وہ سڑک؟"

"ہاں پاکستان میں۔"

شاعر کا قہقہہ گونجا "چھڈ یار۔"

پھر وہی ہوا جو اِن حالات میں ہوتا ہے۔ یعنی شرط بدگئی۔ آپ جانتے ہیں کہ شرط تو صرف بدا کرتی ہے۔ پوری کرنے کا سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ البتہ شرط بدنے کا ایک

www.kmjeenovels.blogspot.com

فائدہ ضرور ہُوا کہ شاہراہِ ریشم پر جانے کا فیصلہ پختہ ہو گیا۔

فیصلے کے بعد دُوسرا مرحلہ تیاری کا ہوتا ہے۔ تیاری کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک سامان تیار کرنا، دُوسرا خود کو تیار کرنا۔ اگر آپ پک نک پر جائیں تو سامان تیار کرنا بے حد اہم ہوتا ہے، اور خود کو تیار کرنا قطعی اہم نہیں ہوتا۔ چھڈ یار کے تحت سامان تیار کرنا قطعی اہم نہیں ہوتا۔ خود کو تیار کرنا بے حد اہم اور دشوار ہوتا ہے۔ چونکہ چھڈ یار کے منشور کی دوسری شق کے مطابق ہر رُکن پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بوجھ اور اپنی اپنی گٹھڑیاں گھر چھوڑ کر جائے۔ اگر آپ اپنے عہدے کی گٹھڑی، معتبری کی گٹھڑیاں، اپنی مَیں کی گٹھڑی گھر چھوڑ دیں تو پھر سفر میں ہلکے پھلکے رہتے ہیں۔ جو ملا، کھا لیا۔ جہاں رات پڑ گئی، پڑ کر سو گئے۔ مُنہ دھویا نہ دھویا۔ بال بنائے نہ بنائے۔ کپڑے بدلے نہ بدلے۔ بلکہ بہتر ہے کہ نہ بدلے۔ ڈھول میں بیٹھ گئے۔ سڑک پر لیٹ کر سو گئے۔ جب مَیں نہ رہے تو سامان اہم نہیں رہتا۔ لیکن مَیں کو خود سے اُتار پھینکنا مشکل ہے۔

چھڈ یار کا مطالبہ ہے کہ بے سر و سامانی میں سفر کرو۔ سامان سر پر اُٹھا کر بسوں کے پیچھے بھاگو۔ سواریوں میں ٹھُس ٹھُسا کر بیٹھو۔ ریسٹ ہاؤس ریزرو نہ کراؤ۔ بلکہ جا کر چوکیدار کی منّتیں کرو۔ اُسے بخشش کا لالچ دو۔ وہ نہ کر دے تو ازسرِ نو تازہ دم ہو کر منّتیں کرو۔ پھر بھی نہ مانے تو ٹلو نہیں، وہیں بیٹھے رہو اور یتیموں کی طرح اس کی طرف دیکھتے رہو۔ سفر کے دوران بازاروں اور سڑکوں پر چلتے ہُوئے عوامی چیزیں کھاؤ۔ مثلاً چنے چباؤ، گنڈیاں چوسو، گنّے کا ٹکڑا مل جائے تو سبحان اللہ۔ پکوڑے کھاؤ تاکہ دیکھنے والے تمھیں خواص نہ سمجھیں، اور تمھارے اندر کا عہدیدار یا دانش ور سر نہ اُٹھائے۔ مگر اب کی بار شاہراہِ ریشم جاتے وقت ہم سے ایک بھُول ہو گئی۔

لیڈر نے کہا "بھئی، بسوں کا کیا ہو گا؟"

شاعر بولا "وہی جو ہوتا ہے۔ یعنی بسیں چلیں گی۔ بسوں کی یہی بُری عادت ہے کہ چلتی رہتی ہیں۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"مگر پہنچتی نہیں" وٹ نے لقمہ دیا۔

انجینئر نے کہا "یہاں سے ایبٹ آباد، ایبٹ آباد سے مانسہرہ تو عام ملیں گی۔ مانسہرہ سے بھشام کی بھی مل ہی جائیں گی۔ لیکن بھشام سے چلاس تک کا پتا نہیں۔ چلاس سے گلگت تک ضرور ملے گی۔ گلگت سے ہنزہ بھی ملے گی۔ ہنزہ سے خنجراب کا پتا نہیں۔"

"پتا نہیں، پتا نہیں" لیڈر نے قہقہہ لگایا "کچھ پتا بھی ہے تجھے؟"

"ٹھیک تو ہے" وٹ بولا "جب سڑک پر ریشم بچھا ہے تو بس نہ ملنے کا مطلب؟"

"بھئی، بس ریشم نہیں دیکھتی۔ سواری ڈھونڈتی ہے۔ سواری ہو گی تو چلے گی" انجینئر بولا۔

"بھئی، سواریاں ہم جو ہیں" وٹ نے کہا۔

"بالکل ہیں" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"بھئی، بس کے لیے وہ سواری نہیں ہوتی جو اندر بیٹھی ہو۔ وہ ہوتی ہے جو باہر لٹکے" داستان گو نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے" وٹ بولا "ہم تو اندر بیٹھیں گے۔ باہر کون لٹکے گا؟"

"باہر لیڈر کو لٹکا دیں گے" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"پھر تو ٹھیک ہے" انجینئر نے کہا۔

"ساتھ ساگ پات بھی دیکھتا جائے گا" داستان گو بولا۔

"میں بتاؤں" لوک نے کہا "مانگے کی جیپ میں کیوں نہ چلیں"

"وہ کہاں سے آئے گی؟" لیڈر نے پوچھا۔

"یہ بات مجھ پر چھوڑ دو" لوک نے جواب دیا۔

"ارے!" سب خوشی سے چلا اٹھے۔

"لیکن پہاڑوں پہ ڈرائیونگ کون کرے گا؟" انجینئر نے طنزاً ہاتھ چلایا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"میں کردوں گا" لوک بولا۔

اس چھت پھاڑ قسم کی آفر پر سب بوکھلا گئے۔ یہ ہماری سب سے پہلی اور فاحش غلطی تھی۔ ایک ایسی حماقت جس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا۔ بظاہر تو یہ خالص خوش قسمتی تھی۔ کون نہیں چاہتا کہ سفر پر اپنی گاڑی ہو، اپنا ڈرائیور ہو۔ جہاں چاہا رُک گئے۔ جہاں تک چاہا، رُکے رہے۔ جب چاہا، چل پڑے۔ اس خوش بختی کا سب سے بڑا اثر تو یہ ہوا کہ ہم سب ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر، گردن اکڑا کر، مونچھ مروڑ کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ معزز عہدے دار، جسے ہم سب بصد مشکل شانوں سے اُتار کر گھر چھوڑ آئے تھے، ہمیں اپنی جیپ میں سوار ہوتے دیکھ کر لپک کر پھر سے کندھوں پر آچڑھا۔ جیپ میں سوار ہونے سے پہلے لیڈر غرّایا "لوائنز! پہلے جائزہ لو کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔"

لوک آگے بڑھا اور بولا "لیڈر، سر! آپ کو علم ہونا چاہیے کہ جیپ سفر کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہے۔ ہمارے پاس کیا نہیں۔ سب کچھ ہے۔ ہمارے پاس دو خیمے ہیں۔"

"خیمے!" سب چلائے۔

"ہاں، خیمے" لوک کے اندر کا انگریز باہر نکل آیا "یہ خیمے آپ ہر جگہ لگا سکتے ہیں۔ پہاڑ پر، دریا کے کنارے، ریت پر، جنگل میں، کہیں بھی۔" اس نے سیلزمین کی طرح دو لپٹی ہوئی چھتریاں باہر نکالیں اور فخر سے بولا "دیکھیے حضرات، یہ کتنی کم جگہ گھیرتے ہیں۔"

"یار، یہ چھتریاں تو رنگ دار بھی ہیں" وٹ بولا۔

"چھتریاں نہیں، خیمے" لوک نے کہا "خیمے سمجھتے ہو؟"

"یہ رنگ دار خیمے تو ہنی مون خیمے لگتے ہیں" انجینئر بولا۔

"تو پھر اپنی اپنی بیویاں ساتھ لے چلیں" شاعر نے قہقہہ مارا۔

"لاحول ولا۔ چھڈ یار میں بیویاں ساتھ لے جاؤ" لوک ہنسا۔

"اور کیا کیا اکوپمنٹ ہیں، اس جیپ میں؟" وٹ نے لوک سے پوچھا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ہر قسم کی اکوپمنٹ۔ اوزار، ٹیپ ریکارڈر، مائیکروفون، کیمرا، دُوربین اور پٹرول کے بھرے ہُوئے کین۔"

"یار، ہم کیا پروفیشنل ٹور پر جا رہے ہیں؟" انجینئر چلّایا۔

"بھئی، کوئی کھانے کی چیز بھی ہے؟" دت نے پوچھا "کہ اکوپمنٹ پر ہی گزارہ ہو گا؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ شاہراہِ ریشم پر تو ہوٹل ہی ہوٹل ہوں گے۔"

"پھر بھی ایمرجنسی کے لیے ہم نے دو درجن تافتانے لے لیے ہیں۔"

"وہ کیا ہوتے ہیں؟"

"میدے میں انڈا گھی ڈالو اور تندور میں روٹیاں لگا لو۔"

"دیکھو، بوائیز" لیڈر چلّایا "میں لیڈر ہوں۔ میں تمھاری ہر ضرورت کا ذمّے دار ہوں۔ راستے میں عیش کراؤں گا۔ پراٹھے اور بُھنا گوشت کھلاؤں گا۔ چائے کافی جب طلب کرو۔"

"اور ساگ پات؟"

"بکو نہیں" لیڈر غصّے میں آگیا "لوک رسیا، تم ڈرائیور ہو۔ آن یور سیٹ۔ بوائیز! گٹ اِن اینڈ وی گو۔"

سب سے پہلا مرحلہ ائیرپورٹ پر جا کر داستان گو کو ریسیو کرنا تھا، اور وہاں سے آن دی روڈ۔

ائیرپورٹ پر داستان گو ایک بڑی سی بوری اُٹھائے ہُوئے برآمد ہُوا۔

"ارے!" سب چلّائے "اتنی بڑی بوری!"

"خان، کیا راستے میں اخروٹوں کا کاروبار کرو گے، جو بوری بھر کر لے آئے ہو؟"

"احمقو!" داستان گو بولا "یہ بوری نہیں، ہیورسیک ہے۔"

"ہیورسیک!" سب چلّائے۔

"تمھیں پک نک پر جانے کا سلیقہ ہو تو معلوم ہو کہ ہیورسیک کے بغیر پک نک پر

www.kmjeenovels.blogspot.com

جانا ممکن نہیں۔"

"ارے! پھر ہم کیسے جا رہے ہیں؟" وٹ بولا۔

"گھبراؤ نہیں" ڈرائیور نے آنکھیں چمکائیں "ہمارے پاس سات سلیپنگ بیگ ہیں۔"

"یک نہ شد دو شد" انجینئر ہنسا۔

"چھوڑ یار" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"اچھا، چھوڑ یار ہے یہ" لیڈر ہنسا "کہ ساتھ خیمے ہیں، سلیپنگ بیگ ہیں ہیور سیک ہے۔"

"برخوردار، پہلے سیاح بننا سیکھو، پھر بات کرو" داستان گو نے دبی زبان سے کہا۔

"سائیلنس پلیز!" ڈرائیور نے اعلان کیا "دی آر آن دی روڈ"۔۔۔ اور جیپ چل پڑی۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

تھاکوٹ

جیپ چلانے سے پہلے ڈرائیور نے اعلان کیا "ہمارا پہلا پڑاؤ اہل ریسٹ ہاؤس ہے۔ وقت کم ہے، فاصلہ زیادہ ۔ لہٰذا گاڑی راستے میں کہیں نہیں رُکے گی۔"

"ارے!" وٹ بولا "یہ ڈرائیور تو لیڈر بن بیٹھا۔ حکم صادر کر رہا ہے۔"

"بوائز!" لیڈر نے غصے میں کہا "گاڑی روکنا یا چلانا میرا کام ہے۔ میں لیڈر ہوں۔"

"لیکن رات پڑنے سے پہلے گاڑی کو اہل ریسٹ ہاؤس تک پہنچانا میرا کام ہے" ڈرائیور بولا۔

"یار، یہ تو میدانی علاقہ ہے" شاعر نے کہا "تم تو پہاڑی علاقے کے لیڈر ہو۔ جب پہاڑ پر پہنچیں گے تو بے شک تمہارا حکم چلے گا۔ فی الحال جو وہ کہتا ہے اُسے کہنے دو۔"

گاڑی ایبٹ آباد کے بازار میں پہنچی تو سب نے شور مچا دیا "روکو، روکو۔"

"معقول وجہ کے بغیر گاڑی نہیں رُکے گی" ڈرائیور بولا۔

"لیڈر، میں نے پہلے ہی تجھ سے کہا تھا" وٹ چلایا "کہ مانگے کی گاڑی میں دم چلو تو اپنی لیڈری کھو بیٹھو گے۔"

"روکو، روکو" سب نے شور مچا دیا۔

"میں حکم دیتا ہوں کہ گاڑی روکو" لیڈر غرّایا۔

"بھئی، بھنے گوشت کی خوشبو آ رہی ہے" شاعر بولا۔

"یہ ڈرائیور کیسا مسلمان ہے، لیڈر، جو بھنے گوشت کی خوشبو پر بھی نہیں رُکتا؟" وٹ نے کہا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"رُک جاؤ، رُک جاؤ" لیڈر غرّایا "ہمیں یہاں سے ایک کیتلی خریدنی ہے"

"بالکل ٹھیک۔ ہاں بھئی، گوشت کی خوشبو پر رُکنا لازم ہے، بشرطیکہ کیتلی خریدنے کا بہانہ موجود ہو" شاعر ہنسا۔

جیپ رُک گئی۔ سامنے اوپن ائیر ہوٹل میں سیخوں پر تکّے بھُونے جارہے تھے۔

"ہم یہاں بیٹھ کر تکّے کھاتے ہیں۔ لیڈر بازار جاکر کیتلی خرید لائے" انجینئر نے کہا۔

"بالکل ٹھیک" شاعر نے قہقہہ لگایا "جس کا کام اسی کو ساجے"

"لیکن تُم نے کیتلی کس لیے خریدنی ہے؟" داستان گو نے پُوچھا۔

"راستے میں چائے بنانے کے لیے" لیڈر بولا۔

"چائے بنانے کے لیے کیتلی نہیں، تام لوٹ خریدنا چاہیے" داستان گو نے کہا۔

"تام لوٹ؟" سب نے حیرت سے دُہرایا "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"کیتلی صرف چائے بنانے کے کام آتی ہے" داستان گو بولا "تام لوٹ میں چائے بنالو، دُودھ گرم کرلو، شیو کرلو، کنوئیں سے پانی نکال لو، ہنڈیا پکالو۔"

"اور گوری کے نام لو لیٹر بھیج دو" وٹ نے لُقمہ دیا۔

"ہاں، ہاں۔ وہ بھی ہو سکتا ہے" داستان گو چلّایا۔

"ہٹاؤ یار، اس جھگڑے کو۔ جو خریدنا ہے، خرید لو۔ ہم یہاں بیٹھ کر تمھارا انتظار کریں گے" انجینئر نے کہا۔

جب لیڈر اور داستان گو تام لوٹ خرید کر بازار سے لوٹے تو شاعر نے قہقہہ لگایا

"یہ تام لوٹ ہے کیا؟ بھئی، یہ تو ڈول ہے ڈول"

"جس بات کی سمجھ نہ ہو، اس میں دخل نہیں دیا کرتے" داستان گو بولا۔

"بالکل درست" انجینئر نے کہا "پہلے تام لوٹ اور ڈول میں تمیز کرنا سیکھو۔ پھر بات کرو"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"تمھیں اتنا بھی پتا نہیں" ڈرائیور بولا "کہ ڈول تو بڑا ہوتا ہے۔"

"بھئی، یہ تو شاعر ہے۔ اسے کیا پتا کہ بڑا کیا ہوتا ہے، چھوٹا کیا ہوتا ہے" انجینئر ہنسا۔

تکّے کھانے کے بعد ہم ایبٹ آباد سے روانہ ہو گئے۔ مانسہرہ کے بعد دفعتاً لیڈر چلّایا "روکو، روکو۔"

"کیوں؟ وجہ؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"یہ بفعہ ہے" لیڈر نے کہا۔

"بفعہ کیا ہوتا ہے؟"

"اس گاؤں کا نام ہے۔"

"چلو، مان لیا کہ یہ بفعہ ہے" ڈرائیور بولا "پھر؟"

"یار، یہ ہمارے ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر کا گاؤں ہے۔ اس لیے رکنا ضروری ہے" انجینئر طنزاً ہنسا۔

"ہمارے سیاسی لیڈروں کا سب سے بڑا گاؤں تو اسلام آباد ہے۔ وہیں رکے رہتے۔ ادھر آنے کی تکلیف کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" شاعر نے کہا۔

"ارے نہیں" لیڈر غرایا "بفعہ کا کھویا بہت مشہور ہے۔ بالکل خالص ہوتا ہے۔"

"میں نہیں مانتا" شاعر بولا "کہ سیاسی لیڈر کے گاؤں کا کھویا خالص ہو۔"

"ہو ہی نہیں سکتا" وٹ بولا۔

"بھئی، ہے، ہے" لیڈر نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہو گا" ڈرائیور نے گاڑی تیز کر دی۔

ٹھہرو، ٹھہرو۔ پہلے فیصلہ کر دو کہ لیڈر کون ہے" لیڈر چلّایا۔

"ہاں بھئی، یہ ٹھیک ہے۔ یہ ڈرائیور تو لیڈر بن بیٹھا ہے۔"

"بالکل نہیں" ڈرائیور بولا "میں تو ڈرائیور ہوں۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"اور میں کنڈکٹر ہوں" لیڈر نے کہا "کنڈکٹر کا کام جانتے ہو؟"

"کنڈکٹر کا کام تو سواریوں سے لڑنا جھگڑنا ہوتا ہے، اور ڈرائیور کا گاڑی چلانا" شاعر نے کہا۔

"نہیں، نہیں" لیڈر بولا "یہ گاڑی میرے کہنے پر چلے گی۔ میرے کہنے پر رُکے گی۔"

گاڑی رُک گئی۔ لیڈر نے چھلانگ لگائی اور گاؤں کی گلیوں میں غائب ہو گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک بڑا سا دونا تھا، جس میں بھورے رنگ کی کوئی چیز تھی۔

"ارے! یہ تو لیٹی نظر آتی ہے۔ چھلک رہی ہے" ڈٹ بولا۔

"ایسا کھویا تو ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔"

"ہاں یار، کھویا تو قائم ہوتا ہے۔ ٹھوس ہوتا ہے۔"

"بھئی، یہ سیاسی کھویا ہے۔ قائم کیسے ہو؟ یہ تو چھلکے گا۔"

دفعتہً انجینئر چلایا "لو ہم شاہراہِ ریشم پر چڑھ گئے۔" سب کی توجہ سڑک پر مرکوز ہو گئی۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

"یہ سڑک تو بھئی، ریشمی نہیں مخملی ہے" ڈرائیور بولا "گاڑی کہتی ہے، مجھے چھوڑ دو، روکو نہیں۔"

"میں نے کہا نہ تھا" لیڈر چلایا۔

"یار، اتنی چوڑی سڑک!" شاعر بولا۔

"مال روڈ لگتی ہے۔"

"اُونہوں۔ مال روڈ کی اماں کہو۔"

اِرد گرد پہاڑیاں ہی پہاڑیاں تھیں جن میں ہریالی کے کارپٹ بچھے ہوئے تھے، اور نیچے وہ مخملی سڑک تھی۔ اتنی چوڑی، اس قدر ہموار کہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے کہا نہ تھا" لیڈر چلایا "یہ سڑک کسی کو سر اُٹھا کر منظر کو دیکھنے نہیں دیتی۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"یار، میرے چٹکی بھرنا" وٹ بولا۔

"اُونہوں۔ دیکھتے رہو۔ خواب دیکھتے رہو۔"

دیر تک جیپ میں خاموشی طاری رہی۔ سب سڑک کو دیکھ رہے تھے۔ جیپ کے پہیے بھی خاموش ہو گئے تھے۔

"یہ تو جیپ پر بہت بڑا ظلم ہو گیا" ڈرائیور بولا "آٹھ روز اس سڑک پر چلنے کے بعد یہ واپس پنڈی کی سڑکوں پر کیسے چلے گی؟"

"تم کیوں چپ ہو؟" لیڈر نے وٹ سے پوچھا۔

"سڑک کو دیکھ کر اس کی وِٹ وِٹ بن کر بہ گئی ہے" داستان گو نے دبی زبان سے کہا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں" وٹ بولا "کہ یہ سڑک کس نے بنائی ہے۔"

"یہ سڑک چین اور پاکستان کے اشتراک سے بنی ہے، مانسہرہ سے چینی سرحد خنجراب تک۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" وٹ بولا "اشتراک تو ہے، لیکن بنائی تو پاکستانیوں نے ہے نا۔"

"پاکستانی کاریگر تو بہت ہیں۔ اس میں شک کیا ہے۔ لیکن انھوں نے ہماری ٹریڈیشن کو برباد کر دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"بھئی، شدھ مسالا لگا دیا۔ سمجھ لو کہ ہماری ریت کا جنازہ نکل گیا۔"

"ہاں، کہتا تو ٹھیک ہے" لیڈر ہنسا۔

"اتنی چوڑی سڑک پہاڑوں پر بنا دینا، انسان کا نہیں، جنوں کا کام ہے۔"

"یہ چینی جن ہی تو ہیں۔"

"جن تو بھئی، ہم بھی ہیں" داستان گو نے کہا "بس مفاد بی کے سر پر چڑھے ہوئے ہیں۔"

"وہ دیکھو" لیڈر چلایا "وہ پہاڑی پر گاؤں۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"گاؤں پہاڑیوں پر ہی تو ہوتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں" وہ بولا "دیکھو تو، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے تبتی گاؤں ہو۔"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ پہاڑ کے اُوپر گاؤں یوں بنا ہُوا تھا جیسے کوئی بڑا سا بگوڈا ہو۔ پہاڑی کے پیچھے سُورج غروب ہو رہا تھا۔ درختوں سے سُورج کی سُنہری شعاعیں چھن چھن کر پہاڑی کی چوٹی پر پڑ رہی تھیں۔ نیچے اندھیرے رینگ رہے تھے اور ان کے نیچے کالی مخمل کی سڑک بچھی ہُوئی تھی۔

سب خاموشی سے سڑک کو دیکھنے میں محو تھے۔ وقت تھم گیا۔ سڑک اُبھرتی گئی، اُبھرتی گئی، حتیٰ کہ کائنات پر چھا گئی۔

دفعتہً گاڑی سڑک چھوڑ کر پہاڑی کی طرف مڑ گئی۔ جیپ کی سواریاں ایک دُوسرے سے ٹکرائیں۔

"ارے! یہ کیا کیا، ڈرائیور؟" لیڈر غرّایا۔

ایک اور دھچکا لگا۔ دُوسرا موڑ کاٹ کر جیپ رُک گئی۔

"لو، ہم اہل ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے" ڈرائیور نے بے نیازی سے کہا۔

سامنے ہموار ٹیلے پر اہل ریسٹ ہاؤس تھا۔ سب گاڑی سے اُتر آئے۔ چوکیدار موجود نہ تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے پختہ فرش کا چبوترا بنا ہُوا تھا، جسے مسجد کے طور پر کام میں لایا جاتا تھا۔ سب مسجد کے فرش پر بیٹھ گئے۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چوکیدار سے کس طرح بات کی جائے؟" وٹ نے کہا۔

"ان پہاڑی لوگوں سے صرف ایک طریقے سے بات ہو سکتی ہے" لیڈر بولا "اسلامی طریقے سے۔ یہ لوگ پکّے مسلمان ہیں۔"

"بس یہی تو خطرہ ہے" وٹ بولا "اگر چوکیدار پکّا مسلمان نکلا تو بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"کیا مطلب؟"

"بھئی، چونکہ ہمارے پاس پرمٹ نہیں لہٰذا وہ ہمیں جگہ نہیں دے گا۔ اور اگر ہم نے رقم پیش کی تو جوتے مار کر ہمیں یہاں سے نکال دے گا" وٹ نے وضاحت کی۔

"ہاں بھئی، ٹھیک کہتا ہے۔ دُعا کرو وہ پکا مسلمان نہ ہو" داستان گو بولا۔

"یار، ہمارے ہاں اسلام نافذ ہو گیا تو" میں نے کہا "مشکل پڑ جائے گی"۔

"اسلام تو آ گیا بھئی، اب اسے کوئی روک نہیں سکتا" داستان گو بولا۔

"اونہوں" شاعر نے کہا "جب تک سیاست دان موجود ہیں، اسلام نہیں آئے گا۔"

"وہ کیوں، جناب؟"

"بھئی، اسلام سیاست دانوں کے مفاد میں نہیں" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"پھر انھوں نے نظامِ مصطفویٰ کا نعرہ کیوں لگایا ہے؟" انجینئر نے پوچھا۔

"انھوں نے نہیں لگایا، غلطی سے لگ گیا ہے" داستان گو ہنسا "جب قدرت کو منظور ہوتا ہے تو سیاست دان اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار لیتے ہیں"۔

"ہٹاؤ یار۔ چوکیدار کی بات کرو" انجینئر بولا "اس وقت سب سے بڑی حقیقت چوکیدار ہے"۔

"چوکیدار سے بات کرنا مجھ پر چھوڑ دو" ڈرائیور نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تم کیسے کرو گے، بات؟" لیڈر غرّایا۔

"بیوروکریٹ کے انداز میں" ڈرائیور نے جواب دیا "جو طریقہ ہمارے ملک میں سال ہا سال سے رائج ہے۔ بیوروکریٹ بن کر بات کرو تو سب سمجھتے ہیں۔ گاؤں والے بھی، شہری بھی، دانش ور بھی"۔

"ہٹاؤ یار، بیوروکریٹ کو تو شہری نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں" انجینئر نے کہا۔

"بالکل، دیکھتے ہیں، نفرت کی نظر سے" ڈرائیور بولا "لیکن سرِ تسلیم خم بھی کر دیتے ہیں"۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"بالکل ٹھیک۔ چونکہ سرِ تسلیم خم کرتے ہیں، پھر خود پر غصہ آنے لگتا ہے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا۔ خود سے نفرت تو کر نہیں کر سکتے، اس لیے بیوروکریٹ سے نفرت کرتے ہیں" داستان گو ہنسا۔

چوکیدار ایک ڈاڑھی والا جوان تھا۔ اس نے ہمارے لیے ریسٹ ہاؤس کھولنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسلامی اور بیوروکریٹ دونوں طریقے فیل ہو گئے۔ پھر مٹھی گرم طریقہ آزمایا گیا۔ اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر میں باری باری ہر ایک نے اپنا اپنا طریقہ آزمایا۔ آخر سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے۔

"چلو بھئی" ڈرائیور بولا "لگاؤ خیمے۔"

"خیموں کی کیا ضرورت ہے۔ بچھاؤ سلیپنگ بیگ۔" اور ہم جیپ سے سامان اُتارنے میں مصروف ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد وٹ بھاگا بھاگا آیا۔ زیرلبی انداز میں بولا "مار لیا میدان!"

سب چونکنے ہو گئے۔

"چوکیدار مان گیا کیا؟" شاعر نے پُوچھا۔

"اونہوں۔ مانا نہیں، لیکن ماننے کے واضح آثار پیدا ہو گئے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"چوکیدار کا سسر اور بیوی آ گئے ہیں۔"

سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"یار، تم اتنے جاہل ہو" وٹ غصے سے چلّایا "اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے، جی حضوریا ہے، اور پیسے کی اہمیت کو جانتا ہے۔ پھر چوکیدار کی بیوی بھی تو ساتھ آئی ہے۔ وہ مسلمان کو راہِ راست پر لے آئے گی۔ بیوی مسلمان کو ہمیشہ راہِ راست پہ لاتی رہی ہے۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"تُو تو سیانا ہو گیا" داستان گو بولا۔

"دیکھ لو" وِٹ ہنسا۔

"ابھی پتا چل جائے گا" لیڈر بولا۔

عین اس وقت ایک بوڑھا آدمی قریب آیا۔ بولا "السلام علیکم۔ صاحب جی، یہاں نہ لیٹیے۔ اِدھر سانپ ہوتے ہیں۔"

"تو پھر ہم برآمدے میں پڑے رہیں گے۔"

"نہیں" وہ بولا "صاحب، برآمدہ سونے کے لیے اچھی جگہ نہیں۔ آپ اندر ہی آجائیں۔"

اس کے عقب میں چوکیدار ریسٹ ہاؤس کا تالا کھول رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں سامان رکھ کر ہم سب نے چھڑیاں سنبھالیں اور باہر سیر کو نکل گئے۔

چاند نکل آیا تھا۔ غالباً وہ چاند کی تیرھویں یا چودھویں رات تھی۔ چاندنی میں سڑک چمک رہی تھی۔ اِردگرد پہاڑیاں اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھیں۔

"یار، یہ ہزارہ کا علاقہ کتنا خوبصورت ہے" ڈرائیور نے کہا۔

"اور زرخیز بھی تو ہے" انجینئر بولا۔

"یہاں کے لوگ پکّے مسلمان ہیں" لیڈر نے کہا۔

"پکّے مسلمان وہیں ملتے ہیں جہاں سے شاہراہ دُور رہو" داستان گو بولا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" لیڈر نے پُوچھا۔

"بھئی، شاہ راہ آئی تو نئے شوشے آئے۔ اپنے اور لگتوں کی قدریں ختم ہوئیں۔"

"بالکل غلط" شاعر بولا "مری کو دیکھ لو۔ سالہا سال سے مری ایک تفریح گاہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں تفریح گاہ ہو گی وہاں مقامی لوگوں کے اخلاق تباہ ہو جائیں گے۔ عورتیں بکیں گی۔ مرد بھڑدے بن جائیں گے۔ لیکن مری نے یہ مفروضہ غلط ثابت کر دیا۔ آج تک مری کی کسی مقامی خاتون نے مال روڈ پہ قدم نہیں رکھا۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"یار، بات تو ٹھیک کہتا ہے، تُو" لیڈر بولا۔

"یاد رکھو، شاہراہ ہنزا ریوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

"او نہوں" ڈرائیور بولا "یہ شاہراہ مری جیسی تفریحی شاہراہ نہیں ہو گی۔ جب چین کی دیو ہیکل بسیں اِدھر چلیں گی تو ہنزا اسے کی شکل بدل جائے گی۔"

"پھر تو یہاں کی مسلمانی بھی چند روزہ سمجھو" میں نے کہا۔

"مطلب یہ ہُوا کہ شاہراہ سسر اور بیوی کا سا اثر رکھتی ہے۔ ریسٹ ہاؤس کا دروازہ کھلوا دیتی ہے" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"ذرا سوچو" ڈرائیور بولا "جب یہ شاہراہ حرکت میں آئے گی تو کیا ہو گا۔ ہنزا رہ کے یہ مزارع، جو آج مشکل سے دو وقت کی روٹی کماتے ہیں، خوش حال ہو جائیں گے۔ یہاں جگہ جگہ ہوٹل اور سٹور کھل جائیں گے۔ یہ باغات، جن کا میوہ منڈی تک نہیں پہنچ سکتا، کیش کراپ پیدا کریں گے۔"

"بالکل، بالکل" انجینئر بولا۔

"اور یہاں چہل پہل ہو جائے گی۔ اکنامک ایفلوانس" ڈرائیور نے دانش مندانہ انداز سے کہا۔

"ہاں" داستان گو بولا "یہاں وہی چہل پہل ہو جائے گی جو ہمارے شہروں میں ہے۔ لوگ مفاد کے چکّر میں پڑ جائیں گے، اور تباہی کا وہی منظر یہاں بھی نظر آئے گا جس کے ہم شکار ہیں۔"

شاعر ہنسا "اسی کو ڈیویلپمنٹ کہتے ہیں۔ ترقی یا ڈویلپمنٹ اسلام کو نچوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایمان کو دھو کر صاف کر دیتی ہے۔ بلتوں کی گفتگو ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔"

داستان گو نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "یا اللہ! اِس اکنامک ایفلوانس سے محفوظ رکھ۔"

"آمین!" شاعر بولا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"لیکن" میں نے بات کرنی چاہی۔

"یہ لیکن اگر مگر چونکہ چنانچہ ہی تو تہذیب کے ستون ہیں" وٹ نے کہا۔

"چھڈ یار" شاعر نے قہقہہ مارا "ہم تو بھگوڑے ہیں۔ تہذیب، دانشوری اور سیاست سے بھاگے ہوئے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئے ہیں۔ اب ہمیں آٹھ دن تو جی لینے دو۔"

"جیو بھائی، جیو" لیڈر ہنسنے لگا۔

"یہ دیکھو۔ یہ چھائی ہوئی گہری خاموشی۔ اس کی بات سنو" داستان گو نے بات شروع کی۔

"ہاں، ہاں۔ وہ بول رہی ہے۔ کچھ کہہ رہی ہے" وٹ نے روڑا اٹکایا۔

"سنو، سنو" سب نے شور مچا دیا۔

وادی میں ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کی آواز میں عجیب سا بےدم تھا۔ دو طرفہ اندھیر کی دیواریں کھڑی تھیں۔ دور کوئی گا رہا تھا۔ بین کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں بلا کی اداسی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ہم اہل ریسٹ ہاؤس سے روانہ ہو گئے۔ چند میل کے بعد انجینئر چلایا "وہ دیکھو۔ وہ بٹل ہے۔"

"بٹل کیا؟" وٹ نے پوچھا۔

"ہمارے ہاں تو بٹھل ایک گہری پرات کو کہتے ہیں" شاعر بولا۔

"بٹل یہاں ایک بازار ہے" انجینئر بولا۔

"دیکھیں تو کیسا بازار ہے" ڈرائیور بولا۔

"اگر ہم راستے کا ہر گاؤں اور بازار دیکھنے لگے تو پھر کہیں پہنچنے کی بات تو ختم سمجھیں" لیڈر غصے سے چلایا۔

"بھئی، ہم پہنچنے کے لیے تو نہیں نکلے۔ ہم تو دیکھنے کے لیے نکلے ہیں۔ راستہ ہی ہماری منزل ہے" شاعر بولا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"بالکل ٹھیک" داستان گو نے کہا "راستے کو نکال دو تو منزل بے معنی ہو جاتی ہے۔"
شاعر نے قہقہہ مارا "زندگی خود ایک راستہ ہے۔ خالی خولی راستہ ہے۔ بٹل بھی راستے پر ہے۔"

"نہیں، نہیں" لیڈر غرایا "ہم بٹل بازار میں نہیں جا سکتے۔ بازار سڑک سے آدھ میل ہٹ کر ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں۔"

"چھوڑ یار" شاعر بولا "ہم تو وقت سے بے نیاز ہونے کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت نہ وقت ہے نہ منزل۔"

"بہر حال، لیڈر کا حکم ہے" ڈرائیور نے آنکھ ماری۔

"ہاں، لیڈر کا حکم ہے کہ ہم بٹل کے بازار میں نہیں جائیں گے۔ کیوں ڈرائیور؟" انجینئر ہنسنے لگا۔

"بالکل نہیں جائیں گے" ڈرائیور نے سنجیدگی سے کہا، اور ساتھ ہی گاڑی روک لی۔

"ارے!" سب چلائے "یہ گاڑی کیوں رک گئی؟"

"ہائیں!" سب ہکا بکا رہ گئے۔ گاڑی بٹل کے بازار میں کھڑی تھی۔

لیڈر نے ڈرائیور پر قصائی کی نگاہ ڈالی، لیکن ڈرائیور اس کی زد سے نکل کر بازار میں ٹہلنے لگا۔

وہ ایک مختصر سا بازار تھا۔ بارہ پندرہ کچی دکانیں تھیں۔ دکاندار کمبلوں میں لپٹے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ چند ایک لوگ بازار میں کھڑے دھوپ تاپ رہے تھے۔ سارا بازار گاہکوں کے انتظار میں سہما ہوا تھا۔

"آہا! کتنا خوبصورت منظر ہے!" انجینئر نے کہا "ذرا اُدھر دیکھو۔ چڑھتے سورج کی روشنی میں پہاڑ کی چوٹی جھل مل جھل مل کر رہی ہے۔"

"حد ہو گئی" ڈرائیور بولا "لوگ پہاڑوں کو دیکھتے ہیں، پتھروں کو دیکھتے ہیں، ندی نالوں

www.kmjeenovels.blogspot.com

کو دیکھتے ہیں، جنگلوں کو دیکھتے ہیں، لیکن اشرف المخلوقات کو کوئی نہیں دیکھتا۔"

"لو بھئی، لوک جاگا" ڈٹ بولا۔

"یار، یہ پہاڑی لوگ اتنے اُداس کیوں ہوتے ہیں؟" انجینئر نے پوچھا۔

"حسین مناظر میں رہتے ہیں نا، اس لیے۔ حُسن اور اُداسی میں ایک گہرا رشتہ ہے" داستان گو بولا۔

"اُونہوں، یہ حسین مناظر میں نہیں رہتے" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ سب مجھ پر برس پڑے۔

"ذرا اِردگرد نگاہ دوڑا کر دیکھو" شاعر بولا۔

"اِردگرد نگاہ دوڑا کر جو ہم دیکھتے ہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" سب نے شور مچا دیا۔

"جب میں نیا نیا اسلام آباد میں آکر بسا تھا تو مجھے گردوپیش میں، روشوں میں، سڑکوں میں، درختوں میں، پہاڑیوں میں، عمارتوں میں، فضا میں، اتنا حُسن نظر آتا تھا کہ فرطِ انبساط سے سانس لینا مشکل ہو جاتا تھا۔ راستہ چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ بات سوچنی مشکل ہو جاتی تھی۔ ٹریفک پر توجہ دینا مشکل ہو جاتا تھا۔ سوچتا یا اللہ! اتنا حُسن فراواں، اتنی دل آویزی، اتنی دل کشی! لیکن آج میں وہاں نہایت آرام اور اطمینان سے گھومتا پھرتا ہوں۔ ہاں کبھی کبھار شک پڑتا ہے کہ منظر حسین ہے۔"

"آہا!" شاعر بولا "مانوسیت بھی کیا نعمت ہے جو انسان کو معمول پر لے آتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" ڈٹ چلّایا "مانوسیت بڑی نعمت ہے۔ لیکن پہاڑی لوگ اُداس کیوں ہوتے ہیں؟"

"ہر جگہ کے نہیں ہوتے" داستان گو بولا "سرسبز پہاڑیوں کے باسی اُداس ہوتے ہیں۔ سنگلاخ پہاڑیوں کے خونخوار ہوتے ہیں۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"یہ لیڈر بھی تو پہاڑیا ہے، لیکن نہ یہ اُداس ہے نہ خونخوار۔ اس کا کیا کریں"؟ وٹ نے کہا۔

لیڈر نے قہقہہ مارا "تم کیا جانتے ہو پہاڑیوں اور پہاڑوں کو۔ مجھ سے پوچھو، مجھ سے۔ میں جو پہاڑوں میں پیدا ہُوا ہوں۔ پہاڑوں میں پلا، جوان ہُوا۔ ایسی پہاڑیاں نہیں جو تم یہاں دیکھ رہے ہو۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اگر تم دھرم سالہ کے پہاڑ دیکھ لو تو سمجھ میں آجائے کہ پہاڑ کسے کہتے ہیں۔"

"میں نے دھرم سالہ کے پہاڑ دیکھے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"تم ـــ" لیڈر ہنسا "تم تو وہاں صرف چھ ماہ رہے تھے۔ چھ مہینے میں پہاڑ نظر نہیں آتے۔"

"چھوڑ یار" شاعر نے قہقہہ لگایا "وہ تو کہتا ہے پہاڑ صرف دو ایک مہینے نظر آتے ہیں۔ پھر آنکھ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور تُو کہتا ہے چھ مہینے نظر ہی نہیں آتے۔"

"بھئی، بات تو پہاڑیوں کی ہو رہی ہے، پہاڑوں کی نہیں" وٹ نے آگ پر تیل چھڑکا۔

"میں نے دھرم سالہ کے پہاڑ بھی دیکھے ہیں" میں نے جواب دیا " کانگڑا کے نچانوں پر مرد خود پسند تھا۔ عورتیں گویا آگ کی بھٹیاں جلائے بیٹھی تھیں۔ ہر آتے جاتے کو یُوں دیکھتیں جیسے سالہا سال سے اسی کے اِنتظار میں بیٹھی ہوں۔ اُونچائیوں پر مرد اُداس تھے۔ اور چوٹیوں پر گدی لوگ ڈل اور بے حس تھے۔ صرف محنت ہی محنت۔ مشقت ہی مشقت۔"

"ذرا صبر کرو" انجینئر بولا "ہزارہ کی اس سرسبز وادی سے جب ہم نکلیں گے اور کوہستان کی حدود میں داخل ہوں گے تو کوہستانیوں کو دیکھ کر تمھارا خون جم نہ گیا تو کہنا۔"

"چھوڑ یار" شاعر ہنسا "اب وہ بات نہیں رہی۔ جو خطۂ تہذیب کی زد میں آجاتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کی ساری خونخواری جو جاتی ہے۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"آج سے پچاس برس پہلے" میں نے کہا "پنڈی سے آگے پشاور تک جاتے ہوئے دل دہلتا تھا۔ ریلوے سٹیشن قلعہ نما ہوتے تھے۔ ریل گاڑی آتی تو قلعے کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔ قبائلیوں کو دیکھ کر پیشاب خطا ہوتا تھا۔"

"بالکل" وٹ چلایا اور داستان گو کی طرف اشارہ کرکے بولا "اب یہ بھی تو پٹھان ہے۔ ذرا دیکھو اس کی طرف۔ اس میں پٹھانیت کی ذرا سی رمق بھی باقی ہے؟"

انجینئر بولا "ایک بار ہم کاغان گئے تھے۔ وہاں ایک کوہستانی آگیا۔ بولا: زیرہ لو، بابو۔ اس کی شکل دیکھ کر اور آواز سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے انجانے میں بٹوا نکالا اور منہ مانگے دام پیش کر دیے، حالانکہ مجھے زیرے کی قطعی ضرورت نہ تھی۔"

"اب تو قبائلیوں کو سات پانیوں میں دھو کر ٹھنڈا کر دیا گیا ہے" شاعر نے کہا۔

"کون سے سات پانی؟"

"تہذیب، پیسہ، سڑک، فیشن، باڑا، تعلیم، آرام پسندی۔"

"وہ دیکھو، وہ" دفعتہً انجینئر چلایا۔ سب نے نگاہ سڑک کی طرف دوڑائی۔ سامنے سڑک کے کنارے، ایک نو بیاہتا جوڑا بیٹھا تھا۔ دونوں یوں اداس بیٹھے تھے جیسے ان پر کوئی تازہ ہونی بیت گئی ہو۔

"ذرا گاڑی روک لو" وٹ چلایا۔

ڈرائیور نے الٹا گاڑی اور تیز کر دی۔

"دونوں ہی مظلوم نظر آتے ہیں" انجینئر نے کہا۔

"ہاں، شادی کے بعد ابتدا میں دونوں ہی مظلوم ہوتے ہیں" میں نے جواب دیا "پھر آہستہ آہستہ دلہن مظلومیت کی گٹھڑی اپنے سر سے اتار کر میاں کے سر پر رکھ دیتی ہے۔"

"بالکل غلط" وٹ ہنسا "یہ لیڈر کو دیکھ لو۔ اس کے سر پر تو مظلومیت کی گٹھڑی نہیں رکھی، بیگم نے۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ساری بات ہی غلط ہے" داستان گو بولا "یہ مفتی کتاب وشنید کی باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے، پہاڑوں کی نچانوں میں عورت بھٹی جلا کر بیٹھی ہوتی ہے۔ اب ہزارہ اور آزاد کشمیر کے نچانوں کو دیکھ لو۔ یہاں عورتیں اتنی پاکیزہ ہیں کہ جواب نہیں۔"

"بالکل درست" لیڈر نے کہا "آزاد کشمیر میں سڑک پر اجنبی آجائے تو عورتیں پہاڑ کی طرف منہ کر کے رک جاتی ہیں، بیٹھ جاتی ہیں۔ اجنبی گزر جائے تو پھر سے سڑک پر چل پڑتی ہیں۔ اُدھر برقعے کا پردہ نہیں، آنکھ کا پردہ ہے، لاج کا پردہ ہے۔"

"صرف مظفر آباد ہی نہیں، ہزارہ، کاغان، سوات، ایبٹ آباد بھی۔ ان پہاڑوں میں بسنے والے لوگ بہت مذہبی اور پاکیزہ ہیں" انجینئر نے کہا۔

"مانتا ہوں، مانتا ہوں" میں نے کہا "لیکن ...."

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔ ہم تمہارے لیکن کے چکر میں نہیں آئیں گے" وٹ نے قہقہہ لگایا۔

"شملہ جاؤ، چنبہ جاؤ، کانگڑا دیکھو" میں نے چلّا کر کہا۔

"یہاں کی بات کرو" شاعر بولا۔

"کافرستان جاؤ۔ گلگت کے شمالی علاقوں میں دیکھو۔"

"کافرستان تو ایک عجیب علاقہ ہے" ڈرائیور بولا۔

"وہاں اُداسی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اتنی اُداسی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ حُسن اور اُداسی۔ لوگ گانے کے پردے میں بین کرتے ہیں۔ یوں ناچتے ہیں جیسے غم کے بوجھ تلے لڑکھڑا رہے ہوں۔"

"روکو، روکو!" لیڈر چلّایا "وہ سامنے تھاکوٹ کا ہینگنگ پُل ہے، وہ سامنے۔"

ہمارے سامنے دریا پہ ایک چھوٹا سا، نازک سا، پُل لٹک رہا تھا۔ پُل کے قریب دو ایک بارکیں تھیں۔ یہاں وہاں، اُلٹی سیدھی قسم کی مشینیں کھڑی تھیں۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"یہاں نہیں" ڈرائیور بولا "ہم دریا پار کر کے رکیں گے۔"

"ہاں، ہاں" انجینئر چلّایا "اِدھر تو ملٹری ایریا ہے۔ سول آبادی اُدھر ہے۔ ارے یار، سول آبادی کو چھوڑو۔ کھانے پینے کی بات کرو۔ ہوٹل کہاں ہے؟" شاعر بولا۔

"یا اللہ!" لیڈر چلّایا "میری قوم مجھ سے منحرف ہو رہی ہے۔ اسے غارت کر۔" سب نے قہقہہ لگایا۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں" شاعر بولا "یہ انحراف کا دور ہے۔ قوم لیڈر سے منحرف ہے۔ لیڈر قوم سے منحرف ہے۔ سُنا تم نے، لیڈر؟"

"عجب شورہ شوری کا دور ہے" لیڈر نے کہا۔

"شورہ شوری نہ ہوتی تو ہم چھڈ یار منانے کا فیصلہ کیوں کرتے؟" شاعر نے قہقہہ مارا۔

"اور اس وقت بھاکوٹ میں نہ ہوتے" دٹ بولا "کیوں، داستان گو تو کیا کہتا ہے؟"

"لیڈر بڑے ہوشیار ہوتے ہیں" داستان گو نے کہا "کوئی پیچھے چلنے والا نہ ہو پھر بھی دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے بلکہ یوں مونچھ مروڑے رکھتے ہیں جیسے ساری قوم ان کے اشارے کی منتظر ہو۔ لیکن ہمارا لیڈر ایسا احمق ہے کہ اپنے منہ سے اعلان کر رہا ہے کہ کوئی پیچھے نہیں چلتا" سب قہقہہ مار کر ہنسے۔

"ہنسو نہیں" انجینئر بولا "پُل پر چلتے ہوئے کورس میں قہقہہ لگانا منع ہے۔"

"وہ کیوں؟" دٹ نے پوچھا۔

"پُل بوجھ سے نہیں ٹوٹتا۔ وائبریشن سے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" لیڈر ہنسا "قہقہے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اچھا پُل ہے یہ۔"

"پتا ہے تجھے کہ پُل پر فوجیں فارمیشن میں مارچ نہیں کرتیں" انجینئر نے کہا۔

"بالکل" ڈرائیور بولا "لے بھرا شور ایک تخریبی طاقت ہے۔"

"لے بھری سُر بھی تو تخریبی طاقت ہے" انجینئر بولا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"بالکل" شاعر نے کہا "دل کا ستیاناس کر دیتی ہے۔"

"جب تک ہم پُل سے گزر نہ جائیں، کوئی بات نہ کرے" لیڈر بولا "ورنہ جماعتی قہقہے کا خطرہ ہے۔"

جیپ آہستہ آہستہ دریا عبور کر رہی تھی۔ فوجی مُعلق پُل کے تختے کڑاؤں کڑاؤں کر رہے تھے۔

ٹھاکوٹ ایک فراخ میدان میں واقع ہے، جس کے درمیان میں دریا بہتا ہے۔ چٹانی زمین کی وجہ سے دریا کا دھارا تنگ جگہ میں مقید تھا۔ اگرچہ پانی بہت گہرا اور موجیں تُند تھیں، پھر بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ دریائے سندھ ہے۔ سندھ اور اتنے لکھ لکھاؤ سے بہے! نچلے میدانی علاقوں میں پہنچ کر تو گویا اس کے سر پر جن سوار ہو جاتا ہے۔ میں نے سیلابوں میں دیکھا ہے کہ اس کا پاٹ چالیس میل پر مُحیط ہو جاتا ہے۔

دریا کے مشرقی کنارے کے پہاڑ سرسبز تھے۔ شاہ کوٹ کے مقام پر وہ شمال کی طرف مُڑ گئے تھے۔ مغربی کنارے پر سوات کا علاقہ تھا جو ریتلا اور بنجر تھا۔ ان پہاڑیوں سے مُردہ مٹی کی بُو آ رہی تھی۔

"ارے! اس ریشمی سڑک کو موڑ کر ادھر بنجر علاقے میں کیوں لے آئے؟" داستان گو نے پُوچھا۔

"ہاں یار۔ راہِ راست تو اِدھر ہی تھی، ہزارہ کی طرف" لیڈر نے کہا۔

"راہِ راست کو کون پُوچھتا ہے" شاعر ہنسا۔

"راہِ راست بڑا پھیکا راستہ ہے۔ دو ایک کجیاں شامل ہو جائیں تو رنگینی پیدا ہو جاتی ہے" میں نے کہا۔

"اونہوں۔ یہ سیاسی کجی ہے۔ سوات کو حصّہ دینا مقصود تھا" انجینئر ہنسنے لگا۔

ہم دریا پار کر چکے تھے۔ بائیں طرف پہاڑ تھا۔ دائیں ہاتھ پتھر کی بنی ہوئی چند ایک

www.kmjeenovels.blogspot.com

دکانیں تھیں۔

"ہوٹل، ہوٹل!" لیڈر چلایا۔

"خشبو، خشبو۔ بھنا گوشت" وٹ نے ہونٹ سنوارتے ہوئے نعرہ لگایا۔

"آگیا، آگیا! دائیں ہاتھ موڑو، دائیں ہاتھ" لیڈر بولا۔

"ارے!" ڈرائیور چلایا "بریک نہیں لگ رہی"

جیپ کھٹاک سے ایک چارپائی سے ٹکرائی۔ تڑاخ تڑاخ چارپائی کے پرخچے اُڑے۔ سب چھلانگیں لگا کر جیپ سے باہر نکل آئے۔

"ویری ساری، ویری ساری" لیڈر چلایا "ہم تاوان ادا کریں گے"

"بالکل بالکل"۔

"بسم اللہ، بسم اللہ" ایک درمیانے قد کا دُبلا پتلا آدمی ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ کہنے لگا "یہ چارپائیاں ہم نے ٹوٹنے کے لیے بنائی ہیں، تاوان بھرنے کے لیے نہیں۔ بسم اللہ، بسم اللہ۔ اندر آئیے۔ چھوٹے، اندر کا کمرا صاف کر دے، ان کے لیے۔ بڑی دیر کے بعد دُور کے مہمان آئے ہیں۔ بسم اللہ، بسم اللہ، بسم اللہ۔ بڑی برکت ہے۔ او صفدرے، دو دڑکے مرغی حلال کر۔ یہ میرے اپنے مہمان ہیں، خاص الخاص — فتنے، ذرا پانی پلا مہمانوں کو" یہ کہ کر وہ اندر باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔

"بھئی واہ!" وٹ بولا "یہ تو صوفی دِکھتا ہے"

"چشتیہ رنگ ہے" داستان گو نے کہا "بالوں کی سیاہی، آنکھوں کی چمک، پیشانی کا عجز"

"صوفی جی، تازہ چائے بناؤں؟" اندر شیڈ سے آواز آئی۔

"بالکل تازہ۔ اور الگ الگ۔ سمجھے؟" اندر سے صوفی بولا۔

"لو بھئی، یہ تو واقعی صوفی نکلا" انجینئر ہنسنے لگا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"نام بھی صوفی، کام بھی صوفی" شاعر نے کہا۔

لیڈر صوفی کے پیچھے گیا اور کمرے میں جھانک کر واپس آ کر بولا "یار، بڑی اچھی جگہ ہے۔ نیچے دریا بہتا ہے۔ سامنے ہزارہ کے پہاڑ استادہ ہیں۔"

"ابے، جگہ کے ساتھ صوفی بھی تو ہے" انجینئر نے کہا۔

"ہاں یار، بڑا اچھا آدمی ہے" لیڈر بولا۔

"اس کا رویہ بڑا نان کمرشل ہے" ڈرائیور نے کہا "پھر اس کا ہوٹل کیسے چل رہا ہے؟"

"پتا نہیں، یار۔ ان لوگوں کا کسی نے بھید نہیں پایا" داستان گو نے جواب دیا۔

"تمھارا بھید بھی تو نہیں پایا، شاہ جی" انجینئر نے داستان گو سے کہا۔

"اونہوں۔ اسے شاہ جی نہ کہو، یار" وہ ٹ زیرِ لب بولا "پتا چل گیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

"پتا چل گیا تو کہہ دیں گے کہ تلقین شاہ ہے۔ کیوں، شاہ جی؟"

"بسم اللہ، بسم اللہ" ملحقہ کمرے سے صوفی کی آواز سنائی دی "جم جم بھاگ کہ تلقین شاہ ہمارے گھر آئے۔ شاہ جی، میں نے کئی سالوں سے آپ کا پروگرام مس نہیں کیا۔"

وہ ایک چھوٹا سا مستطیل کمرا تھا جس میں دریا کی طرف ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ کمرے میں چار چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دو ایک چھوٹی میزیں تھیں۔ ایک اونچی چارپائی پر لحافوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

"اچھا بھئی، ہم ذرا جیپ کی بریک ٹھیک کرا لیں" ڈرائیور اٹھ بیٹھا۔

"بسم اللہ بسم اللہ" صوفی بولا "دریا کے پار مکینک ہے۔ فوجی ورکشاپ بھی ہے۔ چائے پی لیں۔ پھر گاڑی اُدھر لے جائیں۔ جب تک آپ بریک فٹ کرائیں گے، میں کھانا فٹ کر دوں گا۔"

"صوفی جی، آپ ہمیشہ ہوٹل کا کام کرتے آئے ہیں کیا؟" داستان گو نے پوچھا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"نہیں، شاہ جی۔ بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ پہلے کلینری کی، پھر ڈریوری، پھر موٹر مکینک، لوہارا۔ لیکن شاہ جی، ان کاموں میں مزا نہ آیا۔"

"مزا کیوں نہ آیا، صوفی جی؟" شاعر نے پوچھا۔

"یہ سب کام "میں" کو پالتے پوستے ہیں" صوفی نے جواب دیا "میں پھول کر کُپّا بن گئی۔ پھر سرکار کی پیشی ہو گئی۔ سرکار نے اس میں پنکچر کر دیا۔ ساری ہوا نکل گئی تو بولے پُتّر، ایسا کام کر جس میں دوسروں کی ٹہل سیوا ہو۔ اپنی ہیٹی ہو۔ بہت سوچا کہ ایسا کام کون سا ہو سکتا ہے۔ پھر بات سمجھ میں آ گئی۔ شاہ جی، دوسروں کو جی آیاں نوں کرنا، اُن کے جُوتے اُتارنا، پانی پلانا، اور سب سے بڑھ کر مسافروں کو روٹی کھلانا، اس سے بہتر کوئی کام نظر نہ آیا۔ پھر میں نے کہا، چل صوفی، پکیرا سیکھ لے اور ڈٹ جا خدمت پر۔ سو جی، آج یہاں ہوٹل کر رہا ہوں۔"

"کسی شہر میں ہوٹل کیوں نہیں کرتے، صوفی جی؟" انجینئر نے پوچھا۔

"شہر میں مسافر نہیں ہوتے، جی" صوفی نے جواب دیا۔

"مسافر تو ہوتے ہیں" لیڈر بولا۔

"وہ جو مسافر ہوتے ہیں جی، وہ تو ٹیں سے ٹن ٹن کرتے ہیں۔ یوں تن کر بات کرتے ہیں جیسے مالک ہوں۔ مسافر تو جی تھکا ہارا ہوتا ہے۔ ٹوٹا ہوا ہوتا ہے۔ بے بس ہوتا ہے۔ عاجز ہوتا ہے۔"

"سچ کہتے ہو، صوفی جی" انجینئر نے متأثر ہو کر کہا۔

"ہم بھی تو مسافر نہیں" داستان گو بولا "ہم تو ٹورسٹ ہیں۔ اپنی "میں" کے رنگین غبارے بھرے پھرتے ہیں۔"

"نہ شاہ جی" صوفی نے جواب دیا "سرکار فرماتے ہیں، آدمی اُوپر کا نہ دیکھو، بھیتر کا دیکھو۔ اور پھر لوٹا کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو، اپنا کام تو بھر بھر شکاں دینا ہے۔"

"صوفی جی" ملحقہ شیڈ سے آواز آئی "ہانڈی کا پانی سوکھ گیا ہے۔"

"میں ابھی آیا، سرکار" کہہ کر صوفی باہر نکل گیا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"واہ بھئی، واہ! کیا آدمی ہے۔ اگر ہر سو آدمیوں کے پیچھے ایک ایسا آدمی ہو تو ساری مشکلیں حل ہو جائیں۔"

"ساری مشکلیں حل ہو جانا اللہ کو خود منظور نہیں" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک تو ہے" داستان گو نے آہ بھری "ساری لذت راستے کی ہے، منزل کی نہیں۔"

"چھوڑو یار۔ کیا بحث لے بیٹھے۔ ادھر دیکھو۔ دریا کس ٹھاٹ سے بہہ رہا ہے" لیڈر چلّایا۔

"بہتا پانی بھی عجیب چیز ہے" شاعر بولا "دیکھتے رہو تو ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔"

"جبھی تو اللہ والے عام طور پر بہتے پانی کے کنارے بیٹھتے ہیں" داستان گو نے کہا۔

"ایک فرحت ہوتی ہے، ایک تازگی، ایک پاکیزگی۔ ساری ایوولیوشن اس کی مرہونِ منت ہے" ڈرائیور گنگنایا۔

"چھوڑ یار" شاعر گرجا "اب ایوولیوشن کا مسئلہ نہ لے بیٹھنا۔"

"سچ کہتا ہے یہ" داستان گو بولا "نور بابا کے پاس ایک آدمی آیا۔ بولا: بابا، مجھے اللہ دکھا دو، جو کائنات کا خالق ہے۔ بابا اسے ٹالتا رہا، لیکن وہ یہی رٹ لگائے بیٹھا رہا۔ کئی ایک دن گزر گئے۔ ایک دن بابا سوچ میں بیٹھا تھا۔ سائل نے پھر رٹ لگائی: بابا مجھے کائنات کا خالق دکھا دو۔ بابا نے جگ سے پانی کا ایک گلاس بھر کر سائل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بولا: بس اسے پکڑ لے۔ یہی کائنات کا خالق ہے۔"

"واہ! ساری ایوولیوشن کا مسئلہ حل کر دیا" ڈرائیور چلّایا۔

"لیکن بندر کی گتھی تو نہ سلجھی" وٹ بولا۔

"چھوڑ یار" شاعر ہنسا "انسان پہلے بھی بندر تھا، اب بھی بندر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے کھال میں مست تھا، اب چِٹّی قمیص میں مکلّف ہے۔"

"چلو، بھائی" لیڈر چلّایا "ہم بریک ٹھیک کروا لیں۔ پھر کھانا کھا کر آگے چلیں گے۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

ابھی تو لمبا سفر طے کرنا ہے۔"

لیڈر اور ڈرائیور جیپ لے کر چلے گئے، اور ہم چار پائیوں پر لیٹ گئے۔ اس چھوٹے سے دُھواں آلود کمرے میں چُپ چاپ لیٹنے میں ایک عجیب کیفیّت محسوس ہو رہی تھی۔ دیر تک ہم چُپ چاپ لیٹے رہے۔

پھر انجینئر بولا "ایسے لگتا ہے جیسے ہم جھولا جھول رہے ہوں۔"

"یہ دریا کی گھمر گھمر کی وجہ سے ہے" داستان گو نے کہا۔

"نہیں، یار۔ جیپ میں صبح سے سفر کر رہے ہیں، اس لیے۔ کیوں شاہ جی؟ کیا خیال ہے؟" شاعر نے لقمہ دیا۔

"یارو، آمم مُجھ سو، بیر ٹرنہ گُنو،" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ہماری مُشکل یہ ہے" میں نے کہا "کہ ہم جھولا نہیں جُھولتے۔ یہ سوچنے بیٹھ جاتے ہیں کہ کیوں جھولا جھول رہے ہیں۔"

"ہمیں بولنے کی لذّت مار گئی" داستان گو نے کہا "لگتے کہا کرتے تھے کہ تم چُپ رہنا سیکھ لو تو پھر کائنات تم سے باتیں کرنے لگے گی۔"

"بالکل ٹھیک" شاعر بولا "اس وقت دریا ہم سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ہم اس کی نہیں سُنتے، اپنی کہے جا رہے ہیں۔"

"ہاں" میں نے جواب دیا "مہاتما بدھ نے کہا تھا، جو دیکھنا چاہتے ہو تو آنکھیں مُوند لو۔"

"اگرچہ آنکھیں بھی بڑی رُکاوٹ ہیں۔ لیکن سب سے بڑا اشر تو زبان نے ڈھا رکھا ہے" شاعر نے کہا۔

"ہاں" داستان گو بولا "باباجی کہا کرتے ہیں کہ زبان میں ہی مَیں ہے۔ کان تُو ہی تُو ہیں،

www.kmjeenovels.blogspot.com

اور آنکھیں لذّت ہی لذّت ۔ یارو، زبان کو لگام دو، آنکھیں بند کر لو، دریا کی گھر گھر سنو۔ ذرا ہم اس جگہ کی لذّت لیں، اس مقام کی خوشبو اکٹھی کر لیں تاکہ ساتھ لے چلیں۔"

سب خاموش ہو گئے۔ جھولا جھولنے لگے۔ دریا کا گیت اُبھرا۔ اُبھرتا چلا گیا۔

تین بجے کے قریب جب ہم تھاکوٹ سے رُخصت ہوئے تو صوفی سڑک پر کھڑا تھا "بسم اللہ، بسم اللہ" وہ گنگنا رہا تھا "خیر سے جاؤ، خیر سے پہنچو، خیر سے لوٹو۔ تمھارا بہت احسان ہے کہ مجھ ایسوں کو پانی پلانے اور روٹی کھلانے کا موقع دیتے ہو۔ اللہ تمھیں خوش رکھے۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

ڈاسو

تھاکوٹ سے روانگی کے بعد دیر تک جیپ میں خاموشی طاری رہی۔

صوفی کے کردار سے ہم اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ فقرہ بازی کا مشغلہ کافی دیر تک معطل رہا۔

عجیب لوگ ہیں یہ!" داستان گو نے آہ بھری۔

"یار، یہ فرقہ جسے صوفی کہتے ہیں....." لیڈر نے کچھ کہنا چاہا۔

"فرقے کا تو مجھے علم نہیں" داستان گو بولا "صوفی میرے نزدیک ایک رُخ ہے۔ ایک زاویۂ نظر ہے۔"

"ہٹاؤ یار، یہ فلسفہ بازی" لیڈر نے چڑ کر کہا۔

انجینئر بولا "شاہ جی، یہ بتاؤ کہ تھاکوٹ کی خوشبو کیسی رہی؟"

"تھاکوٹ کی خوشبو؟" لیڈر نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمھیں کیا پتا" انجینئر بولا "تم تو ورکشاپ میں پٹرول کی بُو سونگھتے رہے، اور شاہ جی تھاکوٹ کی خوش بُو اکھٹی کرتے رہے۔"

"تھاکوٹ کی خوشبو میں صرف دو عناصر تھے" شاعر نے کہا "ایک تو دریا کی گھمر گھمر اور دوسرا صوفی کا عجز۔"

"تم کبھی مِتھر پار کر نہیں گئے" ڈرائیور بولا "وہاں کی خوشبو انوکھی ہے۔"

"ہاں، بہت انوکھی" داستان گو نے ہاں میں ہاں ملائی۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"کتنے عناصر ہیں؟" وٹ نے پوچھا۔

"لوگوں میں غربت کی بُو ہے، عجز کی بُو ہے، معصومیت کی بُو ہے، اور پھر چاروں طرف پھیلے ہوئے ویرانے ہیں وسعت کی باس ہے" ڈرائیور نے وضاحت کی۔

"کیسا ویرانہ؟" شاعر نے پوچھا۔

"ریت ہی ریت، تاحدِ نظر" ڈرائیور نے وضاحت کی۔

"صحرا کی کیا بات ہے! سارے پیغمبر صحراؤں میں اُتارے گئے۔ عظیم ترین انسان کی تشکیل میں صحرا کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ صحرا کی کیا بات ہے!" انجینئر نے آہ بھری۔

"آہستہ بولو" وٹ نے زیرِ لب کہا "لیڈر سُن رہا ہے۔"

"ایک یہ ہمارا لیڈر ہے جو صحرا میں پک نک کرنے کا قائل نہیں" ڈرائیور نے کہا۔

"یہ تو پہاڑوں کا دیوانہ ہے" انجینئر بولا۔

"پہاڑ انسان کو کبڑا کرتے ہیں۔ صحرا عظیم بنا دیتے ہیں" شاعر نے کہا۔

"سب بے کار ہے" داستان گو نے آہ بھری۔

"بے کار کیوں؟" وٹ نے پوچھا۔

"ہم ایسوں کے لیے کیا پہاڑ، کیا صحرا۔ نہ پہاڑ ہمارا کچھ بگاڑتے ہیں نہ صحرا" داستان گو بولا۔

"وہ کیوں؟" لیڈر نے پوچھا۔

"اس لیے کہ گرد و پیش کی بولی سُننے کے لیے ہم نے خود میں کوئی ریسیور فِٹ ہی نہیں کیا" داستان گو نے جواب دیا۔

"ریسیور تو اللہ نے فِٹ کر رکھا ہے، ہم ہیں۔ لیکن جو اثر ڈالنے کے دیوانے ہوں انھیں اثر لینے کا نہ شعور ہوتا ہے اور نہ فرصت" شاعر نے کہا۔

"ارے!" ڈرائیور چلّایا "یار، یہ بریک پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی۔ ابھی ہم نے

www.kmjeenovels.blogspot.com

کوہستانی علاقے میں سفر کرنا ہے۔ اسے ٹھیک کرائے بغیر بات نہیں بنے گی۔"

"میں بتاؤں؟" انجینئر بولا "وہ سامنے بشام ہے، اور بشام میں فوجی ورکشاپ ہے۔"

بشام ایک نہایت غیر پُر فضا مقام ہے۔ چھوٹے چھوٹے مٹیالے ٹیلوں میں ایک غیر پہاڑی سا میدان۔

"ارے، یہ تو بالکل ہی فلیٹ جگہ ہے" شاعر چلّایا۔

"ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے راتے ونڈ میں آگئے ہوں" ورٹ بولا۔

"قصبہ تو آگے ہوگا۔ یہ تو فوجی کیمپ ہے" انجینئر نے کہا۔

"چھوڑو یار۔ ان کی ورکشاپ تو ادھر ہی ہوگی" لیڈر چلّایا۔

ڈھلان پر چند ایک خیمے لگے ہوئے تھے۔ سامنے ورکشاپ کا بورڈ لگا تھا۔ ورکشاپ کے خیموں کے سامنے دو فوجی کھڑے تھے۔ ایک کام میں مصروف تھا۔ دوسرا بندوق لیے کھڑا تھا۔

"یہاں کا انچارج کون ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"اُدھر میجر صاحب ہیں" سپاہی نے جواب دیا۔

"ہمیں اُدھر لے چلو۔ ہم میجر صاحب سے بات کریں گے۔"

میجر صاحب ایک معمولی سے خیمے میں میز کرسی لگائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہمیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ پھر بولے "مسٹر، ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔ ہاں، اگر آپ کو ٹولز کی ضرورت ہے تو لے لیجیے اور خود بریک ٹھیک کر لیجیے۔" ان کا لہجہ بے حد خشک تھا۔ انداز ایسا جیسے اُکتائے بیٹھے ہوں۔

"تھینک یو میجر۔ ہم بریک خود ٹھیک کر لیں گے۔" ڈرائیور بولا۔

میجر نے ایک مستری سپاہی کو بلایا اور ہدایات دیں، یوں، جیسے کہہ رہے ہوں، انھیں ٹال دو۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

انجینئر اور ڈرائیور کام میں لگ گئے اور ہم سب ورک شاپ سے کچھ فاصلے پر، درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب ہی سپاہیوں کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ دس بیس ہوں گے۔ لیکن ہماری طرف خیموں کی پُشت تھی۔

"یہ تو بڑی سپاٹ جگہ ہے" میں نے کہا۔

"یہاں تو صرف مٹی کی بُو ہے" ورٹ ہنسا۔

"مٹی کی بُو سے بہتر خوش بُو کوئی نہیں۔ کاش کہ کوئی فرم مٹی کا عطر بنا سکتی!" شاعر نے کہا۔

"شاید کسی کمپنی نے بنایا ہو" داستان گو بولا "کیا پتا۔"

"بنایا ہوتا تو پتا چل جاتا" لیڈر نے کہا۔

"نہیں یار۔ پتا نہیں چلتا" داستان گو بولا۔

"وہ کیسے؟" لیڈر نے پوچھا۔

داستان گو کہنے لگا "ہم فیس کریم بناتے ہیں۔ اس لیے خوش بُو بنانے والی کمپنیوں سے ہمارا رابطہ ہے۔ ایک بار میں نے تفریحاً ایک کمپنی کو خط لکھا کہ جناب، میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ انسان کے جسم کی خوش بُو بھی ایک خصوصی چیز ہے۔ اگر مرد کی خوشبو اور عورت کی خوشبو الگ الگ بنائی جائے تو وہ کمرشلی بہت کام کی چیز ہوگی۔"

"کیا کہا، مرد کی خوش بُو؟" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"وہ تو بُو ہوتی ہے" لیڈر ہنسا۔

"تمھارے لیے بُو ہوتی ہے کیوں کہ تم مرد ہو۔ عورت کے لیے تو وہ خوش بُو ہوگی" میں نے کہا۔

"خوشبو تو خیر نہیں کہہ سکتے" انجینئر بولا۔

"خوش بُو میں تو بھئی لطافت کا ہونا ضروری ہوتا ہے" ڈرائیور نے کہا

www.kmjeenovels.blogspot.com

"اگر عورت کی بُو بنائی جائے تو وہ ہم پر کثافت طاری کر دے گی۔"

"بھئی، اس کی یہی تو خوبی ہے کہ کثافت طاری کرتی ہے" میں نے جواب دیا "ہم سب اس کثافت پر جان دیتے ہیں۔"

داستان گو بڑا رند آدمی ہے۔ وہ بات چھیڑ کر چپ ہو جاتا ہے۔ سُننے والے بھڑوں کا چھتّا بن کر بھن بھن کرتے رہتے ہیں۔ دیر تک ہم سب بھن بھن کرتے رہے۔

"ہاں بھئی، تو پھر کیا ہُوا؟" ڈسٹ نے پُوچھا۔ داستان گو چُپ چاپ بیٹھا رہا حتّیٰ کہ سب چلّانے لگے "پھر، پھر، پھر؟"

"پھر" وہ بولا "تین مہینے کے بعد مجھے کمپنی کی طرف سے خط موصول ہُوا۔ لکھا تھا: جناب والا، ہمیں خوشی ہے کہ آپ ہمارے کام میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ انسان کے جسم کی خوش بُو سب سے پہلے ہماری کمپنی نے ۱۷۷۶ء میں بنائی تھی۔"

"ارے! ۱۷۷۶ء میں!" سب چیخنے لگے۔

داستان گو نے سلسلہ کلام جاری کیا "پھر ۱۸۲۴ء میں مسٹر آندرے جوبان نے اس میں ترمیم کی اور ۱۹۰۵ء میں مسٹر کیرن ماؤرزے نے اسے تکمیل تک پہنچا دیا۔ لیکن یہ خوش بو کمپنی نے عام نہیں کی بلکہ اُمرا اور رؤسا تک محدود رکھی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ چونکہ آپ خوش بوؤں سے دلچسپی رکھتے ہیں لہٰذا بطور تحفہ ہم آپ کو عورت کی خوش بُو کی ایک شیشی بھیج رہے ہیں۔ ازراہِ کرم ہمیں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔"

"ارے! ارے!" سب چلّانے لگے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عین اس وقت ہم نے دیکھا کہ چھ سات فوجی، سادہ کپڑوں میں ملبوس، ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

"بھئی، شور نہ مچاؤ۔ وہ ہماری طرف آ رہے ہیں" لیڈر نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"السلام علیکم" وہ بولے۔ پھر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"میں کہتا ہوں، وہی ہے" ایک بولا۔

"نہیں، نہیں یار" دوسرے نے کہا۔

"شرط لگالو" پہلا بولا۔

"تیرا گمان ہے کیا؟" تیسرے نے پوچھا۔ ہم سب حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ بالآخر ان میں سے ایک آگے بڑھا اور داستان گو کی طرف اشارہ کرکے بولا:

"معافی چاہتا ہوں۔ مگر کیا آپ تلقین شاہ ہیں؟"

داستان گو نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"یا علیؓ!" انھوں نے نعرہ بلند کیا، اور پھر — پھر ہم پر یورش کردی۔

چند ایک منٹ میں وہاں ایک مجمع لگ گیا۔ چار آدمی ورک شاپ کی طرف بھاگے تاکہ جیپ کی بریک ٹھیک کریں۔ چار ایک سپاہی کیمپ کے لانگری کی طرف بھاگے کہ شاہ جی کو چینی کی چائے پلانے کا انتظام کریں۔ ایک آدمی بسکٹوں کا ایک لفافہ لے کر آ گیا۔ دس ایک داستان گو کے چرنوں میں آ بیٹھے۔ پھر ہاتھ ملانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک بولا "میں چار سال سے بلا ناغہ تلقین شاہ سُن رہا ہوں۔"

دُوسرا بولا "میں تو تب سے سُن رہا ہوں جب ابھی میں بھرتی نہیں ہُوا تھا۔"

تیسرا بولا "شاہ جی، ذرا تلقین شاہ کی بولی سُنا دیں" ایک ہنگامہ مچ گیا۔

مانا کہ میں داستان گو کا بہت پُرانا دوست ہوں۔ گزشتہ ۳۲ سال سے ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ میں اس کی صلاحیتوں کو مانتا ہوں، لیکن جب بھی لوگ تلقین شاہ کو ہیرو بنا کر بیٹھ جاتے ہیں تو مجھے غصہ آنے لگتا ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اصُولوں کو جھٹلانے والی بات کیسے سمجھ میں آئے۔ تلقین شاہ ایک منفی کردار ہے۔ اس میں کوئی مثبت پہلو نہیں۔ خسیس ہے۔ باتونی ہے۔ جو کہتا ہے وہ کرتا نہیں۔ جو کرتا ہے

www.kmjeenovels.blogspot.com

وہ کہتا نہیں۔ کہتہ ہے۔ باتیں ہی باتیں۔ لچھے دار باتیں۔ باتوں کے جال بُنتا ہے۔ مُنھ زبانی باتیں۔ اس کے باوجود لوگ تلقین شاہ کو پُوجتے ہیں۔ اس کی باتیں سُنتے ہیں۔ سر دھنتے ہیں۔ صدقے واری جاتے ہیں۔ ریڈیو پر آج تک کوئی منفی کردار اتنا مقبول نہیں ہُوا۔

پورے دو گھنٹے بشام میں فوجی لوگ تلقین شاہ کے صدقے واری جاتے رہے۔

جب ہماری جیپ وہاں سے چلی تو وہ سب میدان میں کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

بشام کے بعد سبھی گاڑی میں خاموش بیٹھے تھے۔ داستان گو تو یوں بیٹھا تھا جیسے آرتی چڑھنے کے بعد دیوتا بن گیا ہو۔ دراصل بشام میں فوجیوں کی آؤ بھگت نے ہم سب کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

وہ علاقہ جس سے جیپ گزر رہی تھی، اُجڑا اُجڑا تھا۔ پہاڑ دُور ہٹ چکے تھے۔ مٹیالے ٹیلے قریب آ گئے تھے۔ زمینیں سُوکھی پڑی تھیں۔ لوگوں میں سواتی رنگ کم ہوتا جا رہا تھا۔ کوہستانی عُنصر اُبھر رہا تھا۔

دفعتہً گاڑی دبیر کے بازار میں جا داخل ہُوئی۔

دبیر ایک مختصر سا، میلا سا، بازار تھا۔ گاؤں چالیس پچاس گھروں پر مشتمل تھا۔ دس بیس دُھواں آلود دُکانیں تھیں جہاں دکانداریوں بیٹھے تھے جیسے ازل سے بُجھے ہُوئے ہوں۔

"یہ لوگ ہزارہ سے کتنے مختلف ہیں" ڈرائیور بولا "بُجھے بُجھے تو ہیں، لیکن ان کی اُداسی، اُداسی نہیں ہے۔"

"یہ اُداسی ہزارہ کی اُداسی سے کتنی مختلف ہے" انجینئر نے کہا۔

"بھئی، یہ دیکھتے نہیں، یہ تو گھورتے ہیں" لیڈر بولا۔

"کیا یہ کوہستانی لوگ ہیں؟" میں نے پُوچھا۔

"ابھی کوہستانی کہاں" انجینئر نے جواب دیا۔

"ان میں سرحدی لوگوں کا رنگ غالب نظر آتا ہے" شاعر بولا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"سرحد کے لوگوں کا باہر نہ دیکھو، ان کے اندر دیکھو۔ باہر سے گھورتے نظر آتے ہیں" داستان گو نے کہا۔

"اور اندر سے؟" وٹ نے پوچھا۔

"یہ داستان گو خود پٹھان ہے نا، اس لیے ان کے اندر کا بھید جانتا ہے" لیڈر نے لقمہ دیا۔

"اونہوں۔ یہ میری رائے نہیں" داستان گو بولا "یہ آرنلڈ کی رائے ہے۔ آرنلڈ ایک انگریز تھا۔ کھاتے پیتے گھر کو لات مار کر پاکستان آ گیا۔ اتفاق سے وہ مجھے مل گیا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ میرے ہاں وہ دو تین مہینے رہا۔ میں نے اس سے پوچھا: آرنی، تو ایک امیر باپ کا بیٹا ہے، پھر تو کیوں در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے، پردیس میں؟ کہنے لگا: میں مغرب کی افلوانس سے بے زار ہوں۔ بے راہ روی سے بے زار ہوں۔ وہاں کی فرسٹریشن سے بے زار ہوں۔ میں چار سال ملک ملک گھوما ہوں۔ اطمینان و سکون کی تلاش میں در بدر ہُوا ہوں۔ اور اب، اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں پاکستان میں رہوں گا۔ یہاں غربت ہے۔ امن ہے۔ سکون ہے۔ کیا پنجاب میں رہو گے؟ میں نے پوچھا۔ بولا: نہیں، میں سرحد میں رہوں گا۔ سرحد کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ باہر سے کڑوے ہیں۔ غُصیل ہیں۔ اندر سے مساوات کو مانتے ہیں۔ وہ سُخنے نہیں۔ ہپوکریٹ نہیں۔"

"پھر؟ پھر؟" سب نے شور مچا دیا۔

اس وقت ہم دبیر کے بازار میں گھوم پھر رہے تھے۔ لوگ ہماری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"بتاؤ یار۔ اب وہ آرنی کہاں ہے؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ایک مہینا ہُوا مجھے اس کا فون آیا تھا" داستان گو نے کہا "فون پر آرنی کہنے لگا کہ میں یہاں لاہور میں لوم گلڈ ہوٹل میں ٹھہرا ہُوا ہوں۔ ملنے کو جی چاہتا ہے۔ کہو تو آ جاؤں۔ میں

www.kmjeenovels.blogspot.com

گاڑی لے کر بھاگا۔ بڑی مشکل سے پوم گلڈ کا پتا چلا یا۔ یہ ہوٹل قلعہ گوجر سنگھ کے پچھواڑے ایک پرانے بوسیدہ دو منزلہ چوبارے میں واقع ہے۔ میں تو حیران رہ گیا۔ اس میں ہوٹل کی کوئی بات نہ تھی۔

"یہاں وہاں ہر جگہ چارپائیاں ہی چارپائیاں کھڑی تھیں۔ جو بھی آتا، اسے ایک چارپائی دے دیتے، اور رات کے پانچ روپے لے لیتے۔ بس ہوٹل کا اتنا ہی کام تھا۔ البتہ ایک کونے میں کڑک چائے کا سٹال لگا ہوا تھا۔ سارا چوبارہ کچھا کچھ ہپیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں باری باری سب کمروں میں گھوما۔ آخری کمرے میں داخل ہوا تو ایک سواتی نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ارے! میں چلایا۔ تم آرنی ہو؟ وہ مسکرا کر بولا: نہیں، آرنی نہیں، میں عبداللہ ہوں۔ اور وہ دیکھو، اُدھر۔ میرے روبرو ایک سواتن عورت بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ یہ کنیز فاطمہ ہے، وہ بولا، میری بیوی۔ تو کیا سوات میں شادی کر لی ہے تو نے؟ نہیں، وہ ہنسا کنیز فاطمہ فرانسیسی ہے۔ ان دونوں کو دیکھ کر بالکل یقین نہ آتا تھا کہ وہ فارنیر ہیں۔"

"تو کیا وہ سوات میں رہتا ہے؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ہاں، سوات میں۔ میں نے اس سے پوچھا: بتا، تیرا گزارہ کیسے چلتا ہے؟" داستان گو نے کہا "آرنی بولا: اسی طرح جس طرح دی ہولی پرانٹ کا گزارہ ہوتا تھا۔ میں نے تھوڑی سی زمین خرید لی ہے۔ مٹی کا ایک کوٹھا تھوپ لیا ہے۔ گھر میں ایک بکری ہے۔ آٹھ مرغیاں ہیں۔ ہم انڈے کھاتے ہیں، دودھ پیتے ہیں، سارا دن دھوپ سینکتے ہیں، اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔ یہ پٹھان بہت اچھے لوگ ہیں۔ وہ ہمیں اپنا جانتے ہیں۔ غیر نہیں سمجھتے۔"

"یار، ہمیں بھی ملاؤ کبھی، اس سے" انجینئر نے کہا۔

"تم اس کی باتیں نہیں سمجھ سکو گے، اس لیے کہ ہم سب افلوانس کے مارے ہوئے ہیں۔ افلوانس دورِ حاضرہ کی سب سے بڑی لعنت ہے" میں نے کہا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"افلوانس ہمیں تو نصیب ہی نہیں ہوئی"، شاعر بولا "حسرت ہی رہی" سب نے قہقہہ لگایا۔

دفعتہً ہم نے دیکھا کہ بازار کے اختتام پر ہم ایک شوریدہ سر نالے کے پل آپہنچے ہیں، جہاں بیسیوں فوجیوں کا جمگھٹا ہے اور سب لوگ حیرت اور رشک بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔

"بھئی، یہ سڑک کیوں بند کر رکھی ہے آپ نے؟" لیڈر چلایا۔

"سڑک بند ہے" قریب کھڑا فوجی بولا "آگے مرمت ہو رہی ہے"۔

پل پر بڑا خوشگوار سماں تھا۔ پانی اتنی تیزی سے بہ رہا تھا جیسے طوفان میں بہہ پتھروں سے ٹکرانے کی وجہ سے پانی کی پھوار دور دور تک اڑ رہی تھی۔ پھر پن چکیوں کی گھمر گھمر اور جاتے خالوں کا شور۔ نالے پر پہنچ کر بازار کی اداسی اور گھٹن دور ہو گئی۔

دفعتہً ایک فوجی افسر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا اور خشک لہجے میں ہم سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟ آپ کون ہیں؟ پوچھ گچھ کرنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔

"یار، یہ ہمیں مشکوک کیوں سمجھ رہے ہیں؟" لیڈر بولا۔

"سمجھنے کی کیا بات ہے بھئی۔ ہم تو ہیں ہی مشکوک" ورمے بولا۔

"وہ تو ظاہر ہے" شاعر نے کہا "سوال یہ ہے کہ ہم کیوں مشکوک ہیں؟"

"نہیں، سوال یہ ہے کہ ہم میں کون مشکوک ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

"ہاں، یار۔ کوئی ہے ضرور" وٹ بولا۔

"صرف ڈرائیور ہے جس پر شک کیا جا سکتا ہے" داستان گو بولا۔

"وہ کیوں؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ سواریاں تو سواریوں جیسی ہی ہیں، ڈرائیور ٹرک ڈرائیوروں جیسا

www.kmjeenovels.blogspot.com

نہیں۔ اس لیے مشکوک ہے" داستان گو نے کہا۔

"ہاں بھئی، ڈرائیور تو خالص انگریزنہ ٹائپ ہے" شاعر بولا۔

"بس یہی بات ہے" وٹ ہنسا "انھیں ڈر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پھر سے قبضہ جمانے کے لیے ہراول پارٹی کے طور پر اسے بھیجا ہے تاکہ جائزہ لے۔"

ابھی ہماری بحث جاری تھی کہ دو فوجی آ گئے۔ بولے "اگر آپ کو جلدی ہے تو چلیے، آپ کو لے چلتے ہیں۔ آپ ہماری جیپ کے پیچھے پیچھے آ جائیں۔"

جب ہم جیپ میں بیٹھ رہے تھے تو وٹ نے کہا "یار، ان سے یہ بھی تو پوچھنا تھا کہ لے تو جا رہے ہو، پر لے جاؤ گے کہاں؟ کہیں نظربند کرنے تو نہیں لے جا رہے ہے؟"

"کیوں؟ سکھّے شاہی ہے کیا؟" لیڈر غصّے میں چلّایا۔

"وہ تو ہے" وٹ بولا "صورتِ حالات دیکھ لو"

"وہ صورتِ حالات جسے دیکھ کر ہم راولپنڈی سے بھاگے ہیں اور یہاں چھڈیاں منانے آئے ہیں، واقعی مخدوش ہے" شاعر نے سنجیدگی سے کہا "ایک طرف ایک پارٹی کھڑی ہے، دوسری طرف دوسری۔ ایک ترقّی کی رٹ لگا رہی ہے، دوسری اسلامی نظام کا ورد کر رہی ہیں۔ بازاروں اور گلیوں میں لوگ جمع ہیں۔ انھیں کچھ نہیں پتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ البتّہ چاہتے ہیں کہ کچھ ہو جائے۔ چاہے کچھ بھی ہو، مگر ہو جائے۔ بازار اور گلیوں میں دھول اُڑے۔ یہ سکھّے شاہی نہیں کیا؟"

"بالکل ہے" انجینئر بولا۔

"نہ ہوتی تو سات شریف آدمی یوں چھڈیاں منانے کے بہانے ان پہاڑوں میں جوتے نہ چٹخا رہے ہوتے" ڈرائیور بولا۔

"رُک جاؤ، رُک جاؤ" فوجی چلّائے۔ جیپ رُک گئی۔

دونوں فوجی جیپ سے اُتر کر ہمارے پاس آئے۔ بولے "گاڑی آگے نہیں جا سکتی۔ سڑک پر تیل بچھا ہوا ہے۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"سڑک پر تیل؟ سڑک پر تو پتھر ہوتے ہیں، لُک ہوتا ہے، بجری ہوتی ہے۔ یہ تیل کہاں سے آیا؟" انجینئر بولا۔

"یہ چینی جو ہیں ان کا اپنا ہی حساب ہے" فوجی نے جواب دیا "پہلے پتھر کوٹتے ہیں، پھر تارپین کا تیل ڈال لیتے ہیں۔ پھر کوٹتے ہیں اور آخر میں کول تار بچھا دیتے ہیں۔"

شام کے گھسمسے میں وہ ایک خوفناک جگہ تھی۔ دونوں طرف چیل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی اونچی لمبی دیواریں کھڑی تھیں۔ سڑک کے دائیں ہاتھ پندرہ بیس فٹ کا ہموار میدان تھا۔ اس کے عین درمیان میں سیمنٹ کا چبوترا بنا ہوا تھا۔ ہم سب اس چبوترے پر جا بیٹھے۔

"اس ویرانے میں چبوترا؟" لیڈر نے کہا۔

"یہ تو ہیلی پیڈ معلوم ہوتا ہے" انجینئر نے جواب دیا۔

"یہاں ہیلی کاپٹر اُترنے کا مطلب؟" وٹ بولا۔

"ارے بھئی،" انجینئر نے کہا "یہ پٹن کا علاقہ ہے۔ پچھلے سال پٹن میں بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔"

"ہاں، ہاں۔ اخباروں میں خبریں آئی تھیں" داستان گو بولا۔

"شاید یہ ہیلی پیڈ ان دنوں بنایا گیا ہو، ریسکیو کے لیے، پروویژن کی سپلائی کے لیے" انجینئر بولا۔

رات پڑ چکی تھی۔ اُونچے لمبے پہاڑ کالے بھوتنے بن چکے تھے۔ اس مقام سے خوف آنے لگا تھا۔

"یار، جو ہمیں نظر بندی کرنا تھا" شاعر نے فوجیوں سے کہا "تو کسی اچھی جگہ کرتے"۔ فوجی ہنسنے لگے۔

"تلقین شاہ جی، اپنے اگلے پروگرام میں اس وی آئی پی ٹریٹمنٹ کا ذکر ضرور کرنا جو

www.kmjeenovels.blogspot.com

فوجیوں نے ہمیں دیا ہے" میں نے ترپ کا پتّا پھینکا۔

تلقین شاہ کا نام سُن کر فوجیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان کا انداز یکسر بدل گیا۔

"پھینک دیا، بھئی، ترُپ کا پتّا" وٹ زیرِ لب بولا۔

یہ سُن کر پہلے تو فوجی تلقین شاہ سے پروگرام کی باتیں کرتے رہے، پھر سڑک پہ کام کرنے والے چینیوں اور مزدوروں کو ڈانٹنے لگے: بھئی جلدی کرو۔ رات پڑ گئی ہے اور ہمارے مہمانوں نے جلدی پہنچنا ہے۔

ہیلی پیڈ سے رُخصت ہو کر ڈرائیور کو دو میل تک تیل سے بھیگی ہوئی سڑک پر بڑی احتیاط سے گاڑی چلانی پڑی۔

"دیکھو، بھئی۔ بولنا نہیں" لیڈر نے کہا "ایک تو تیل کی پھسلن ہے، دوسرے سڑک خطرناک ہے، اور تیسرے گھُپ اندھیرا ہے۔"

پٹن کا یہ علاقہ بڑا خوفناک تھا۔ دو رُویہ اُونچے اُونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ سڑک گھومتی بل کھاتی جا رہی تھی۔ ہر چند ایک منٹ کے بعد موڑ آ جاتا جس پر گاڑی چلانا بڑی چابکدستی کا کام تھا۔

بنر پہاڑ ویران تھا۔ دُور دُور تک بستی کا کوئی نشان نہ تھا۔ سڑک پر کوئی گاڑی آ جا نہ رہی تھی۔ اس خوفناک راستے کو دیکھ کر سبھی خاموش بیٹھے تھے۔

گھنٹوں گزر گئے۔ جیپ آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ راستہ ویسے ہی بند بند رہا۔

"کتنی خوفناک جگہ ہے!" لیڈر بولا۔

"ہاں، بھئی۔ پٹن کا علاقہ ہے" انجینئر نے کہا۔

"اچھا تو یہ وہ پٹن ہے" داستان گو بولا "جس کی امداد کے لیے دُنیا بھر سے چیزیں آئی تھیں۔"

"ہاں" ڈرائیور نے کہا "بستر، کمبل، کپڑے، خوراک، فارن ایکسچینج اور دُودھ۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ہاں" وٹ چلایا "وہ دودھ جو آج بھی پنڈی کے بازاروں میں بک رہا ہے۔"

"وہ کمبل بڑے عمدہ تھے" لیڈر نے کہا "میں نے بھی ایک خریدا تھا، مارکیٹ سے۔"

"خریدنے والے بھی نہال ہو گئے اور بیچنے والے بھی" ڈرائیور بولا۔

"نہیں یار" داستان گو نے احتجاجاً کہا "وہ چیزیں تو عوام میں بانٹی گئی تھیں۔ اخباروں میں دس پندرہ دن تصویریں چھپتی رہی تھیں۔ کمبل دیے جا رہے ہیں۔ اناج کی بوریاں تقسیم کی جا رہی ہیں۔"

"ہاں، ہاں۔ بڑی بڑی تصویریں چھپی تھیں" وٹ نے کہا "رسکیو کرنے والے فوٹوگرافر ساتھ لاتے تھے۔ پہلے وہ ہیلی کاپٹر کی سیر کرتے پھر تصویریں کھچواتے اور پھر انھیں شاہ سرخیوں کے ساتھ اخباروں میں چھپواتے۔"

"اس علاقے کی ڈویلپمنٹ کے منصوبے بھی تو بنے تھے" داستان گو نے کہا۔

"بالکل بنے تھے" شاعر بولا۔

"ان پر عمل درآمد بھی کر دیا گیا" انجینئر ہنسا۔

"نظر تو نہیں آتا، اِدھر کوئی عمل درآمد" داستان گو نے کہا۔

"شاید اُدھر پٹن میں ہو" ڈرائیور بولا۔

"پٹن میں نہیں" وٹ بولا "اسلام آباد سکرٹریٹ کی فائلوں میں جا کر دیکھو۔ آنکھیں نہ کھُل جائیں تو کہنا۔"

دفعتہً گاڑی رُک گئی۔ ہمارے سامنے ایک نالا تھا۔ نالے پر ایک بہت بڑا چھپر بنا ہُوا تھا۔

"لو بھئی، ہوٹل تو آ گیا" لیڈر بولا۔ ہوٹل میں چھ سات لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"پٹن یہاں سے کتنی دُور ہے؟" ڈرائیور نے پُوچھا۔

ایک سفید ریش بوڑھا ہمارے پاس آ کھڑا ہُوا۔ بولا "صاب، یہی پٹن ہے۔"

"یہاں آبادی تو نہیں" شاعر نے کہا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"آبادی نیچے ہے" بابا نے جواب دیا۔

"راستہ کدھر سے جاتا ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"آدھ فرلانگ آگے جاؤ۔ پھر دائیں ہاتھ نیچے اُتر جاؤ۔"

"ہٹاؤ یار" شاعر بولا "راستہ تلاش کرنے کا فائدہ؟ اسی ہوٹل میں کیوں نہ رات بسر کر لیں۔"

بابا کے ہوٹل میں چھپّر تلے چار پائیوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ ہم نے کھانا کھایا اور لیٹ گئے۔

بابا کے ہوٹل والی وہ رات مجھے آج تک نہیں بھولی۔ چاروں طرف خوفناک سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ نالے میں بہتے ہُوئے پانی کی مسلسل گھُمر گھُمر اس مہیب سناٹے کو اور بھی سنگین بنا رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے فطرت اس سناٹے کی زبان سے آفرنیش کا راز بیان کر رہی ہو۔ قدرت کے تخلیقی چکّر کا بھید کھول رہی ہو۔

پتا نہیں کس اصُول کے تحت پہاڑوں میں پُر فضا مقامات سطحی جذبات پیدا کرتے ہیں اور خوفناک مقامات دل کی گہرائیوں میں عظیم جذبات جگا دیتے ہیں۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ہم بابا کے ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔

اس روز سبھی خاموش تھے۔ وٹ کو کہنے کے لیے کوئی بات نہ سُوجھ رہی تھی۔ لیڈر سنگلاخ پہاڑوں کو حسرت کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ داستان گو بدھ بھکشوؤں کا سا آسن جمائے بیٹھا تھا۔

ماحول اس قدر بوجھل تھا کہ ہم ایک عجیب سی گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ اُونچے اُونچے پہاڑ اپنا گھیرا مسلسل تنگ کرتے جا رہے تھے۔ گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ ننگی سنگلاخ چٹانوں سے گرمی کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ سڑک پر آبادی کا نشان تک نہ تھا۔

دوپہر کے قریب ایک موڑ کاٹنے کے بعد دفعتہً ہم ایک آبادی میں داخل ہُوئے۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ارے! یہ آبادی کیسی ہے؟" وٹ بولا۔

"یار، یہ تو برونزِ کالا پانی، کالا پہاڑ نظر آتا ہے" شاعر نے کہا۔

"یہ ایک نہیں، دو آبادیاں ہیں" انجینئر نے جواب دیا۔

"دو آبادیاں ایک ہی جگہ، ساتھ ساتھ!"

"یہ ڈاسو ہے، سوات کا آخری قصبہ۔ اور وہ اُدھر سامنے کومیلا، کوہستان کا پہلا قصبہ۔ درمیان میں دریا ہے۔ اِدھر ڈاسو، اُدھر کومیلا" انجینئر نے وضاحت کی۔

"میں نہیں مانتا" میں نے کہا "یہاں دریا ہوتا تو کچھ تو خنکی ہوتی۔"

"کیا واقعی درمیان میں دریا ہے؟" شاعر نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں بھئی۔ وہ دیکھو، درمیان میں فوجی پل ہے۔ یہ وہی دریا ہے جو ہم نے تھاکوٹ پر عبور کیا تھا" انجینئر نے مزید وضاحت کی۔

"اونہوں۔ یہ وہ دریا نہیں" وٹ بولا "اس میں گیلا پانی نہیں معلوم پڑتا۔ بھئی، وہ تو خوشگوار دریا تھا۔ ہوا میں نمی تھی۔ ٹھنڈک تھی۔ یہاں تو گرمی کی بھڑاس کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"ضرور یہ لاوے کا دریا ہو گا۔ جبھی تو یہ جگہ جہنم معلوم ہوتی ہے" داستان گو بولا۔

"کتنا خوفناک مقام ہے!" ڈرائیور نے جھرجھری لی۔

"روکو، یار، روکو! کہیں سے چائے کا پیالہ پئیں" لیڈر بولا۔

"رُکنے کو جی نہیں چاہتا" ڈرائیور نے کہا "رُکے تو دم گھٹ جائیں گے۔"

"ہاں یار، یہ شہر نہیں، بھٹی معلوم پڑتی ہے۔"

"روکو، روکو" لیڈر غرّایا "ہم رُکیں گے۔" گاڑی رُک گئی۔

ہوٹل دھواں دھار تھا۔ کمرے میں بوریوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں چار پانچ پٹھان ڈرائیور پڑے تھے جیسے تلے ہوئے کریلے ہوں۔

"ہٹاؤ بھئی۔ یہ تو دم گھٹ مقام ہے" میں نے کہا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ہوں۔ پانی پیو اور چل پڑو" ڈرائیور بولا۔

"جانا کہاں ہے، بابو؟ آگے سڑک بند ہے" پٹھان ڈرائیور قہقہہ مار کر ہنسا۔

راستہ بند ہے!" لیڈر نے دہرایا" لیکن کیوں؟"

"دیکھو، بابو، اَم اِدھر دس سال سے ٹرک چلا رہا ہے۔ جب کوئی بولتا ہے کہ سڑک بند ہے اَم رُک جاتا ہے۔ جب کوئی بولتا ہے کہ سڑک کھل گیا تو اَم چل پڑتا ہے۔"

"کب سے اِدھر رُکا ہُوا ہے، آپ؟" انجینئر بولا۔

"چار دن سے" خان نے جواب دیا۔

"چار دن سے!" سب نے حیرت سے دہرایا۔

خان ڈرائیور نے قہقہہ لگایا۔ بولا "صاحب، اس سڑک پر چلنے کے لیے صبر ہونا چاہیے۔ جہاں روکا رُک گئے۔ جہاں چلایا، چل پڑے۔ رُک گئے تو رُکنے کا غم نہیں۔ چل پڑے تو چلنے کی خوشی نہیں۔"

"لیکن راستہ بند کیوں ہے؟ وجہ کیا ہے؟" لیڈر نے پُوچھا۔

"بس بند ہے۔ پتا نہیں کیوں بند ہے" اس نے جواب دیا۔

"کب کھلے گا؟" انجینئر نے پُوچھا۔

"کچھ پتا نہیں۔ چاہے آج کھل جائے، چاہے چار دن بند رہے" دوسرا ٹرک ڈرائیور بولا۔

"چار دن اور بند رہے گا؟" لیڈر چلایا "ہماری چھٹیاں تو یہیں ختم ہو جائیں گی۔"

"یہ بڑی مشکل ہُوئی" انجینئر نے کہا۔

"چلو، یہیں سے واپس چلے جائیں" ورٹے نے مُنھ بنایا۔

"پیچھے بھی تو سڑک بن رہی ہے" خان بولا "اگر پیچھے بھی سڑک بند ہُوئی تو کیا کرے گا؟ نہ اِدھر کا رہے گا نہ اُدھر کا۔"

"مارے گئے یار" شاعر تڑپ کر بولا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"سمجھ لو جنازہ نکل گیا" وٹ نے منہ بنایا۔

"صبر، بابو، صبر۔ اس سڑک پر چلنے کے لیے صبر چاہیے" ٹرک ڈرائیور ہنسا۔

"یہاں کوئی افسر ہے، جس سے بات کی جا سکے؟" انجینئر نے پوچھا۔

"بس ایک کرنیل ہے" خان ڈرائیور نے جواب دیا "ادھر مینلا میں اس کا کیمپ ہے، دریا کے پار۔"

بہت سے خیموں کے درمیان کرنل کا دفتر ایک چھوٹے سے کوارٹر میں واقع تھا۔ دروازے پر ایک سپاہی بندوق اٹھائے چلچلاتی دھوپ میں کھڑا تھا۔

"ہے جوان، ہمیں کرنیل صاحب سے ملنا ہے" ڈرائیور نے کہا۔

"کون ہے تم؟" وہ بولا۔

"ہم اسلام آباد سے آیا ہے۔"

"تو پرچی پر نام پتا لکھواؤ۔ ام پرچی لاتا ہے۔"

چار ایک منٹ کے بعد سپاہی اندر سے ایک پرچی اور پنسل لے آیا۔

"کیا نام ہے؟" وہ بولا "باپ کا نام؟ کہاں کا ہے؟ گاؤں کا نام؟"

"اسلام آباد" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"تحصیل کا نام؟"

"یہی کافی ہے، خان" انجینئر بولا۔

"بائی، یہ کافی نہیں ہے۔ ام جو بولتا ہے، یہ کافی نہیں ہے۔"

"تم کرنیل صاحب کو جا کر دکھاؤ تو" لیڈر نے کہا۔

"نہیں" وہ بولا "کیسے دکھائے ام؟"

"کیوں؟"

"بس، یہی حکم ہے کہ پرچی پوری لکھو" سپاہی نے کہا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"اچھا تو پوری لکھ لو" ڈرائیور بولا۔

"بولو۔ تحصیل کا نام؟" سپاہی نے پُوچھا۔

"اسلام آباد" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"گاؤں کا نام بھی اسلام آباد، تحصیل کا نام بھی اسلام آباد" سپاہی نے مشکوک نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

"بالکل" انجینئر نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا۔ ضلع کا نام؟" سپاہی نے پُوچھا۔

"اسلام آباد" انجینئر نے جواب دیا۔

"تو ہم سے مخول کرتا ہے؟" سپاہی بگڑ گیا۔

دت آگے بڑھا "بھئی خان صاحب سے مذاق نہ کرو ـــ لکھو خان: گاؤں اسلام آباد، تحصیل راولپنڈی، ضلع چک لالہ" شاعر قہقہہ مار کر ہنسا۔

خان نے پرچی پھاڑ دی اور رائفل اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

"اب اس سے بات نہ کرنا" داستان گو نے کہا "گولی مار دے گا"

اتنے میں ایک اور سپاہی آ گیا "کیا بات ہے؟" اس نے پُوچھا۔

"کرنل صاحب سے ملنا ہے" انجینئر نے جواب دیا۔

"کیا کام ہے؟"

"سڑک کے بارے میں پوچھنا ہے" ڈرائیور نے کہا۔

"کیا پوچھنا ہے؟"

"کہ سڑک کب کُھلے گی؟"

"جب کُھلے گی، کُھل جائے گی" سپاہی نے کہا "وہ دیکھو، ڈیڑھ سو ٹرک یہاں رُکا پڑا ہے۔ چار روز ہو گئے ہیں"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ہم حکومت کے آدمی ہیں۔ ہم نے واپس جانا ہے" انجینئر نے کہا۔

"تو جاؤ۔ واپس جاؤ۔ کون روکتا ہے" سپاہی بولا۔

"بے کار ہے، یار۔ چھوڑو" شاعر نے زیرِ لب کہا "خواہ مخواہ یہاں دھوپ میں اپنا اکلیٹ بنا رہے ہو"

"چلو، بھئی، چلو" وٹ چلایا، اور ہم وہاں سے واپس چل پڑے۔ راستے میں ڈرائیور کہنے لگا "یار، اس ہوٹل میں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ آگے ہی سڑک بند ہے۔ چلو، پیچھے چلتے ہیں۔ دو چار میل دُور کوئی پُرفضا مقام ضرور مل جائے گا، جہاں پانی کا چشمہ ہو، درختوں کا سایہ ہو۔ وہاں جا کر پڑاؤ کریں گے، خیمے لگائیں گے، اور آرام کریں گے۔ کیوں کیسا؟"

"ہاں یار، ہوٹل میں جانے کو جی نہیں چاہتا" شاعر بولا۔

"ہوٹل کہاں ہے؟ تندور ہے" وٹ نے منہ بنایا۔ اور ہم واپس پتن کی طرف چل پڑے۔ اس تجویز سے سب متفق تھے۔

ابھی ہم ڈاسو سے ایک میل دُور گئے ہوں گے کہ برلب سڑک ایک ٹھنڈی کھوہ نظر آئی۔ اس کھوہ میں ایک چوڑا سا ربڑ کا پائپ لگا ہوا تھا، جس میں سے پانی کا اتنا موٹا دھارا بہ رہا تھا۔

ڈرائیور نے جیپ روک لی "واہ! کیا مقام ہے!"

"یہ پائپ کیوں لگا ہوا ہے؟" انجینئر نے پوچھا۔

"بس لگا ہوا ہے" وٹ نے کہا "آم کھاؤ، پیڑ نہ گنو"

"یہ لگا نہیں، لگایا گیا ہے۔ دیکھو، اُوپر سے پانی پائپ کے ذریعے لایا گیا ہے۔ پھر یہاں اسے سپورٹ دے کر کھڑا کیا گیا ہے" ڈرائیور نے وضاحت کی۔

"بالکل، بالکل۔ تاکہ ہم اس دھارے کے نیچے کھڑے ہو کر نہا سکیں" وٹ چلایا۔

"ہاں، یار۔ میں بھی نہاؤں گا" شاعر نے کپڑے اُتارنے شروع کر دیے۔ ابھی ہم نہانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ ایک واٹر ٹینک ٹرک آ گیا، اور دو چینی ٹرک سے اُتر کر چیں چاؤ چاؤ

www.kmjeenovels.blogspot.com

چلّانے لگے۔ ٹرک بیک ہو کر دھارے کے نیچے آ کھڑا ہُوا۔

"دیکھا؟" انجینئر بولا "یہ چینیوں کا واٹر ڈپو معلوم دیتا ہے۔ انھوں نے یہ دھارا سوچ سمجھ کر بنایا ہے۔"

"اے، بابو صاحب" ایک سپاہی آ دھمکا "یہاں اڈّا نہ بناؤ۔ یہ چینیوں کا واٹر ڈپو ہے۔"

"سنتری" ڈرائیور نے پوچھا "اس سڑک پر قریب ہی کوئی اور ایسی جگہ ہے جہاں پانی کا چشمہ ہو اور جہاں ہم قیام کر سکیں؟"

"اونہوں" اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ سارے پہاڑ بنجر ہیں۔ پٹن کے قریب کوئی چشمہ مل جائے تو پتا نہیں۔"

"ہم نیچے دریا میں خیمے لگا لیں تو کیسا رہے؟" ڈرائیور نے انجینئر سے پوچھا "وہ دیکھو، نیچے دریا کے کنارے پر ریت بچھی ہُوئی ہے۔"

"لیکن نیچے جانے کا کوئی راستہ بھی ہو" انجینئر نے جواب دیا۔

"نہیں ہے تو بنا لیں گے۔ کیوں سنتری جی؟" ڈرائیور نے کہا۔

"یہ قبائلی علاقہ ہے، بابو صاحب" سنتری بولا "بستی کے سوا کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ رات بسر کرنی ہے تو ڈاسو جاؤ۔ اِدھر اُدھر کیمپ نہ لگانا۔"

"یہ جگہ بہُت اچھی تھی" لیڈر بولا۔

"یہاں کیمپ لگانے کی اجازت نہیں" سنتری نے کہا۔

"یار، ٹھیک ہے۔ ڈاسو چلے جائیں گے۔ لیکن یہاں نہا تو لیں" رات تک ہم وہاں نہاتے رہے۔ پھر مجبوراً ڈاسو واپس چلے گئے۔

ڈاسو پہاڑوں کے درمیان واقع ہونے کے باوجود ایک تپتا ہُوا صحرا تھا۔ چاروں طرف پہاڑوں سے بھبھکا اُٹھ رہا تھا۔ ہوٹل کا چولھا مسلسل دھواں دے رہا تھا۔ وہاں رات گزارنا ایک عذاب نظر آ رہا تھا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

سورج غروب ہونے کے بعد خنکی ہونے کے بجائے لو کا جھکڑ چلنے لگا۔ کسی مسخرے نے افواہ اُڑا دی کہ سڑک کھلنے والی ہے۔ ٹرک ڈرائیور اپنے اپنے ٹرک کی طرف بھاگے۔ ڈیڑھ سو ٹرکوں کے انجن سٹارٹ ہو کر مزید بھڑاس نکالنے لگے۔

"بند کر دیار، بند کر دو" داستان گو چلایا "ہم کب تک اس تپتی ہوئی جیپ میں بیٹھے انتظار کریں گے کہ کب سڑک کھلتی ہے۔"

"بھئی، سڑک کھلنے والی ہے" لیڈر غصے سے بولا۔

"کھلنے والی ہے تو کیا ہوا؟" شاعر بولا۔

"ڈیڑھ گھنٹے سے ہم جیپ میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ خواہ مخواہ۔ کھل جائے گی تو دیکھا جائے گا" داستان گو نے کہا۔

"اونہوں۔ یہ سڑک نہیں کھلے گی" سنتری قریب آ کر بولا۔

"تو کیا ہمیں رات یہیں بسر کرنی پڑے گی؟ اس تندور میں؟"

"یارا" وہ بولا "دو سال سے ہم اس تنور میں پڑے ہیں۔ یہاں سارا دن تندور جلتا ہے۔ شام کو لو کا جھکڑ چلتا ہے، اور رات کو مچھروں کی فوج چڑھائی کر دیتی ہے" سپاہی نے کہا۔

"اتنی گرمی میں مچھر؟" داستان گو نے حیرت سے پوچھا۔

"یہاں کے مچھر خاص الخاص ہیں" سپاہی نے کہا "جو گرمی میں مرتے نہیں، پلتے ہیں۔"

"رات تو ٹھنڈی ہو جاتی ہو گی" لیڈر نے پوچھا۔

"اونہوں۔ رات کو آندھی چلتی ہے۔ روز بلا ناغہ بجلی چمکتی ہے۔ بڑی خوف ناک کڑک۔ دل دہل جاتے ہیں۔"

"اچھا پہاڑ ہے یہ!" لیڈر چلایا۔

"یہ پہاڑ نہیں، کوہستان ہے جیسا موسم ہے، ویسے ہی لوگ ہیں" سپاہی نے کہا۔

"کھڑ فیار" لیڈر چلایا "کیوں نہ ہم ہوٹل کی چھت پر رات گذاریں؟ میں ہوٹل والوں

www.kmjeenovels.blogspot.com

سے بات کرتا ہوں۔"

ہوٹل کی چھت ہموار تھی۔ اس پر دس ایک چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔

"چھت پر سونا منع ہے" سپاہی نے کہا۔

"کیوں؟" ڈرائیور غصے سے بولا۔

"پرے کوہستانیوں کے گھر ہیں بے پردگی ہوتی ہے۔ تم تھانے میں ڈیرا لگالو۔ تمھیں چارپائیاں دے دیں گے" سپاہی نے کہا۔

رات کو ہم نے تھانے میں ڈیرا لگا لیا۔ ڈرائیور نے ہموار جگہ پر دونوں خیمے لگا لیے۔ یہ خیمے عروسی نوعیت کے تھے۔ ایک خیمے میں دو فرد سو سکتے تھے۔ اُٹھنے یا بیٹھنے کی گنجائش نہ تھی۔ رینگ کے اندر داخل ہونا پڑتا تھا۔ اور پھر یوں جیسے کوئی لحد میں آ پڑا ہو۔

آدھی رات کے وقت آندھی چلنے لگی۔ پہلے تو ہوا سیٹیاں بجاتی رہی، پھر ریت اُڑنے لگی۔ ساری وادی غبار آلود ہو گئی۔ بالآخر گرج چمک شروع ہو گئی۔ یہ گرج بھی عجب قسم کی تھی۔ ہر کڑک پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بجلی ہم پر گری ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بم باری ہو رہی ہو، اور دشمن تاک تاک کر نشانہ لگا رہا ہو۔ ہم نے بھاگ کر جیپ میں پناہ لی۔ لیکن جیپ میں مکھی مکھی جتنا بڑا مچھر ہمارا منتظر تھا!

www.kmjeenovels.blogspot.com

الائچی نالا

اگلے روز دوپہر کے قریب سڑک کھلنے کا اعلان ہو گیا۔ ڈرائیور نے شور مچا دیا "جلدی، جلدی۔ اگر ہم ٹرکوں کے بیچ میں پھنس گئے تو مارے جائیں گے۔"

جب سڑک کھلی تو ہماری جیپ سب سے آگے تھی۔ ہمارے پیچھے سو ڈیڑھ سو ٹرک تھے۔

"ارے! یہ سڑک ہے کیا؟" ڈرائیور چلایا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"ذرا دیکھو تو!"

ہم نے آگے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ سامنے پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

"بھئی، وہ سڑک کہاں ہے" وٹ چلایا "جو انھوں نے کھولی ہے، اگر یہ پتھروں کا ڈھیر سڑک ہے تو اسے بند کرنے یا کھولنے کا مطلب؟"

"ہاں، یار۔ کہتا تو ٹھیک ہے" شاعر نے وٹ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"شکر نہیں کرتے کہ انھوں نے ٹریفک کھول دی ہے" لیڈر نے کہا "اگر ڈاسو میں ایک رات اور بسر کرنی پڑتی تو طبیعت صاف ہو جاتی۔"

"اُف!" وٹ سر سہلاتے ہوئے بولا "بڑے دھکے لگ رہے ہیں، یار۔"

"دھکے تو لگیں گے۔ سڑک ہی ایسی ہے۔ پتھروں کا ڈھیر لگا ہے۔ گاڑی کے دباؤ سے پتھر لڑھک جاتے ہیں" ڈرائیور بولا "حالانکہ میں پانچ میل کی سپیڈ سے چل رہا ہوں۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

وہ منظر عجیب تھا۔ سوڈیڑھ سو ٹرک پتھروں پر لڑھک رہے ہیں۔ انجن گھاؤں گھاؤں کر رہے تھے۔ پہیوں تلے سے پتھر پھسلتے اور پھر یوں اُڑتے جیسے بٹیرے ہوں۔ ہمارے دل سہمے ہوئے تھے۔ اب گرے کہ اب گرے۔

موٹے پٹرول کی بُو سے دماغ پھٹے جا رہے تھے۔ سورج جھنڈا گاڑ کر سر پر کھڑا تھا۔ چٹانوں سے گرمی یوں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی جیسے چیڑ سے بروزہ رستا ہے۔ ہوا بند تھی۔ سڑک پر درخت، پودے یا جھاڑی کا نشان تک نہ تھا۔ دُور نیچے دریا یوں بہ رہا تھا جیسے مکھیوں کا چھتا بھنبھنا رہا ہو۔ دریا کے باوجود ہوا میں نہ خنکی تھی نہ نمی۔ ہم پہ بے نام خوف و ہراس طاری تھا۔

"واہ! کیا ریشمی سڑک بچھی ہے" وٹ بولا۔

"خبردار!" لیڈر غرّایا "اگر تُو نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی تو میں تجھے اُٹھا کر دریا میں پھینک دوں گا۔"

"اللہ کے واسطے پھینک دو" وٹ نے ہاتھ جوڑ کر کہا "وہاں پانی تو ہوگا، کم از کم۔"

"پانی میں تو تیری لاش پہنچے گی" شاعر غرّایا۔

"چلو، لاش ہی سہی۔ میری لاش تو پانی میں ہو گی۔ تیری لاش کو تو اِدھر گدھ کھائیں گے" وٹ نے کہا۔

"یہاں تو گدھ بھی نہیں آئیں گے" انجینئر بولا۔

"بکواس بند کرو" ڈرائیور غرّایا "اگر میری توجہ ذرا بھٹکی تو ساری لاشیں دریا میں تیریں گی۔"

"کیا فرق پڑتا ہے" انجینئر بولا۔

"بڑا فرق پڑتا ہے" داستان گو بولا "دیکھ لو، ذرا سے موسم سے کتنا فرق پڑ گیا ہے۔ قہقہے تیوریوں میں بدل گئے ہیں۔ جملوں کی جگہ گالیاں برسنے لگی ہیں۔"

"بند کرو اپنا فلسفہ" لیڈر غرّایا "ڈرائیور کی توجہ بھٹکی تو ـــــ"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"تو ڈرائیور کا چاچا لگتا ہے کیا؟" شاعر بولا۔

"ارے!" سب چلّائے۔ جیپ نے شدید ہچکولا کھایا۔ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد وٹ نے خود کو سنبھالا۔ بولا "یارو، ہم خیریت سے ہیں کیا؟"

کسی نے جواب نہ دیا۔

"کیا ہم سڑک پر ہی ہیں؟" وٹ نے پوچھا۔

"کیا پتا" شاعر نے کہا "سڑک کہاں ہے؟ یہاں تو پتھر ہی پتھر ہیں۔"

"شکر ہے، کوئی تو بولا۔ میں سمجھا تھا کہ میں واحد سروائیور رہوں۔"

"چوں چوں، چی چی، چن" باہر سے آواز آئی۔

"یہ چڑیاں کہاں چہکنے لگیں؟" وٹ بولا۔

"بے وقوف! خاموش! سامنے چینی سڑک روکے کھڑے ہیں" ڈرائیور بولا۔

"سامنے پتھروں پر چینی یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے گڑ کی بھیلیوں پر چیونٹے۔

"رک کیوں گئے، ڈرائیور؟" انجینئر بولا۔

"آگے سڑک بند ہے" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"پھر بند ہے کیا؟" سب چلّائے۔

"سڑک تو ہے ہی نہیں، پھر بند کرنے کا مطلب؟" شاعر نے منہ بنایا۔

"گاڑی سے اتر جاؤ" رائفل والا حوالدار قریب آ کر چلّایا۔ آگے بلاسٹنگ ہو رہا ہے۔ پتھر گرے گا۔ مغز پھٹ جائے گا۔ کور لے لو، کور۔"

ورارڑارم!

ورڑا رڑارم! ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ پہاڑوں نے مزید اچھالا۔ سب نے

www.kmjeenovels.blogspot.com

جیپ سے چھلانگیں لگا دیں، اور کور لینے کے لیے بھاگے۔ آدھ گھنٹے تک دھماکوں کی قیامت بپا رہی۔ سب یوں جیپ تلے یا اطراف میں دبکے ہوئے تھے جیسے وہ بلاسٹنگ نہیں، ائیر ریڈ ہو۔

آدھ گھنٹے کے بعد حوالدار کی آواز سنائی دی "بلاسٹنگ خلاص۔ بلاسٹنگ خلاص۔"

ساتوں مُردے جیپ تلے سے نکلے۔

"حوالدار، حوالدار" لیڈر چلایا "اب سڑک کھل گئی ہے کیا؟"

"خو، بابو، اب تو سڑک بالکل بند ہوگیا ہے، بلاسٹنگ سے۔ سڑک پر پتھر کا ڈھیر لگ گیا ہے، ڈھیر کو صاف کرے گا، پھر راستہ بنے گا۔ جب اِدھر کا راستہ بن جائے گا تو اُدھر بلاسٹنگ ہوگا۔"

"خان، راستہ کب کھلے گا؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"کیا خبر" وہ بولا "چار دن لگ جائیں۔"

"چار دن! وٹ چلایا "دوڑو، دوڑو، یارو۔ میں بے ہوش ہونے لگا ہوں۔ جلدی سے میرے منہ میں پانی ڈالو۔"

وہ جگہ ڈاسو سے بھی بھیانک تھی۔ اُونچے اُونچے بلیے چٹیل پہاڑوں کی دو متوازی دیواریں کھڑی تھیں۔ درمیان میں ایک گہرے اور تنگ کھڈ میں دریا بہ رہا تھا۔ پہاڑوں پر نہ جھاڑی تھی، نہ پودا، نہ درخت۔ گھاس کا پتا تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ کسی جگہ ہریاول یا سائے کا نشان نہ تھا۔ چٹانیں تپ رہی تھیں۔ ان سے گرمی کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ سڑک پر پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس ڈھیر پر ڈیڑھ سو ٹرکوں کی قطار کھڑی تھی۔

کوئی بھی ٹرک سیدھا نہ تھا۔ کوئی اِدھر جھکا ہوا تھا، کوئی اُدھر۔ کوئی عین کنارے پر کھڑا ڈول رہا تھا۔ نیچے گہرا کھڈ تھا۔ بائیں ہاتھ ایک چھوٹے سے میدان میں پندرہ بیس دم پخت قسم کے موٹے موٹے خیمے لگے ہوئے تھے۔ یہ چینیوں کا کیمپ تھا۔ اس کے ساتھ ہی

www.kmjeenovels.blogspot.com

اُونچی نیچی زمین پر پاکستانی حوالدار کا خیمہ تھا، جس میں چھ سپاہی مُقیم تھے۔ ساتھ ہی بلاسٹنگ کے لیے بارُود کا ذخیرہ تھا۔

ہم نے منظر کی طرف دیکھا۔

"یارو، میں بے ہوش ہونے لگا ہوں" وِٹ چلّایا "سٹیچر کا انتظام کر لو۔"

"غم نہ کھاؤ" شاعر بولا "ہم تمہیں اُٹھا کر نیچے کھڈ میں پھینک دیں گے۔"

"یارو، کہتا تو ٹھیک ہے" انجینئر بولا "صورتِ حال اچھّی نہیں۔"

لیڈر دوڑتا ہُوا آیا "حد ہو گئی، بھئی، حد ہو گئی" وہ چلّایا "ٹرکوں کے سارے ڈرائیور رُوپوش ہو گئے ہیں۔"

"کیا سارے کے سارے؟" میں نے پُوچھا۔

"ایک بھی دکھائی نہیں دیتا" لیڈر نے کہا۔

"بھئی، وہ ٹرکوں کے نیچے پڑے ہوں گے" انجینئر نے کہا۔

"ٹرکوں کے نیچے؟" شاعر نے حیرت سے دُہرایا۔

"ہاں، یہاں اور کہیں سایہ بھی ہو" انجینئر ہنسا۔

"اچھّا، تو سالے اپنا اپنا سایہ ساتھ لائے ہیں" وِٹ بولا۔

"ہم تو جیپ تلے لیٹنے سے رہے" لیڈر نے آہ بھری۔

"گنجائش ہی نہیں" شاعر نے کہا۔

"حوالدار صاحب، حوالدار صاحب، یہاں کہیں سایہ ہو گا؟" لیڈر نے پُوچھا۔

حوالدار نے سر نفی میں ہلا دیا "خو، یہ تو دوزخ ہے، دوزخ، بالبو صاحب۔ یہاں سایہ کدھر سے آیا۔"

"چلو، یار۔ چار دن یہاں دوزخ میں رہنے کی ریہرسل ہی کر لیں گے" وِٹ بولا۔

"چار دن ــــ؟" ڈرائیور غُصّے سے چلّایا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"اوئے حوالدار، کہیں پانی ملے گا؟" شاعر نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں" حوالدار بولا "وہ سامنے موڑ پر نالا ہے۔"

چینی کیمپ کے عین مقابل ایک بڑا نالا تھا۔ پانی اُوپر سے آتا اور ایک چھوٹے سے میدان میں جمع ہو جاتا، اور پھر نیچے گرتا، جہاں ایک وسیع چوبچہ سا بنا ہُوا تھا۔

پانی کو دیکھ کر سب نے چوبچہ میں چھلانگیں ماردیں۔ نہانے کے بعد ہوش آیا تو شاعر بولا "لیڈر، ایک پیالہ چائے کا مل جائے تو۔۔۔۔"

"خبردار! جو کسی نے گرم مشروب کا نام لیا تو" انجینئر بولا "یہ جگہ تو خود چائے کی گرم کیتلی ہے۔ یہاں چائے کا نام نہ لو۔"

"وہ ہومیوپیتھی والے تو کہتے ہیں کہ گرمی کو گرمی کاٹتی ہے" وٹ بولا۔

"یار، چائے تو میں بنادوں" لیڈر نے کہا "لیکن یہاں چولھا جلانے کے لیے لکڑی کہاں سے ملے گی۔"

"ہاں، یار۔ یہاں تو گھاس کا تنکا تک نہیں جلانے کو۔"

"تو پتھر جلالو" وٹ بولا۔ سب قہقہہ مار کر ہنسے۔

"ہنسنے کی بات نہیں، یار" وٹ بولا "کوئی نہ کوئی جلنے کا پتھر مل ہی جائے گا۔"

"ہٹاؤ، یار، چائے کو۔ کچھ کھانے کو مل جائے۔ کوئی بسکٹ۔ کوئی پھل۔ کوئی چیز۔"

"ہاں، یار۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

"ارے! وہ جو تافتانے ہیں ہمارے پاس" لیڈر چلّایا "جاؤ، یار، جاؤ۔ وہ تافتانوں کا پیکٹ تو اُٹھا لاؤ، جیپ میں ہے۔"

پانچ ایک منٹ کے بعد وٹ منہ لٹکائے تافتانوں کا تھیلا اٹھائے لوٹا "ارے یار، یہ تو بڑی ظالم جگہ ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہُوا؟"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ایسی ظالم گرمی ہے کہ گھی بھی اویپوریٹ ہو گیا" وٹ نے رونی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پراٹھے سوکھے ٹکڑے بنے ہوئے ہیں۔"

"ارے! سچ کہتے ہو کیا؟"

"چلو، سوکھے ٹکڑے پانی سے نگل لیں گے" لیڈر نے کہا۔

"اونہوں۔ یہ سوکھ کر کاٹھ نہیں بنے، پتھر کی سلیں بن گئے ہیں۔ پانی سے نگلیں نہیں جائیں گے" وٹ بولا۔

ہر کسی نے ایک ایک ٹکڑا اُٹھا لیا۔

"اونہوں۔ یہ تو بالکل ہی کاٹھ بن گئے ہیں" انجینئر نے کہا۔

"یار، ہم کھائیں گے کیا؟" داستان گو نے پوچھا۔

"گرمی جو ہے، کھانے کو۔ گرمی کھاؤ۔ پانی پیو" وٹ چہکا۔

"بکواس نہ کر" شاعر چلایا۔

"کرنے دے، یار، بکواس" داستان گو بولا "اور یہاں کرنے کو ہے ہی کیا۔ اب کیا بکواس بھی نہ کرے؟"

"بی سیریس، بوائز" لیڈر بولا "نہ یہاں ہوٹل ہے، نہ دکان۔ نہ لکڑی ہے۔ جس سے چولھا جلایا جا سکے۔ پھر یہ بھی پتا نہیں کہ یہاں ہمیں کتنے دن رکنا پڑے۔"

"ہاں، یار۔ بات تو ٹھیک ہے" سب سنجیدہ ہو گئے۔

"بالکل غلط" وٹ بولا "یار، ہم اکیلے تو نہیں۔ ہمارے ساتھ ڈیڑھ سو ٹرک ڈرائیور جو ہیں۔"

"ہاں، یار۔ وہ تو ہم بھول ہی گئے" لیڈر نے کہا۔

"مرگ انبوہ ہے۔ جشن رہے گا" وٹ بولا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

شام کو جب ہم نالے سے باہر نکل کر سڑک پر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ واقعی جشن ہو رہا ہے۔ ہر ٹرک کے پہلو میں چولھا جل رہا ہے۔ توے پر پراٹھے پک رہے ہیں۔

"ارے!" داستان گو بولا "یہ تو جیسے برات اُتری ہوئی ہے۔"

"خان صاحب" لیڈر ایک ٹرک ڈرائیور کی طرف لپکا "خان، یہ چولھا جلانے کو لکڑی کہاں سے لی؟"

"خو، ہم ساتھ لایا" وہ بولا "سب کچھ ساتھ لایا۔ لکڑی، آٹا، مسالا، مرغی، گھی۔ سب کچھ۔"

"ارے! لکڑی بھی ساتھ لایا؟" انجینئر نے پوچھا۔

"یہاں سب کچھ ساتھ لانا پڑتی ہے۔ میرے پاس پندرہ دن کا راشن ہے۔"

"ادر ہمارے پاس پورے مہینے کا" دوسرا ٹرک ڈرائیور بولا۔

"ہمارے پاس بھی ہے" داستان گو نے سوکھے ٹکڑوں کا تھیلا جھلایا۔

"میں بتاؤں؟" وٹ بولا "ٹکڑے چباؤ اور پراٹھے سونگھو۔ پراٹھے کا مزا نہ آئے تو میرا ذمّہ۔"

"ارے نہیں۔ ان کے مہمان بن جاؤ۔ یہ لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں" شاعر نے کہا۔

"اس صورتِ حال میں نہیں ہوتے" ڈرائیور ہنسا۔

"ایک ایک ڈرائیور سے ایک ایک نوالہ مانگو تو . . . ." شاعر رک گیا۔

کدو

"ارے! مانگنا نہیں" حوالدار نے ہمیں دھمکی دی "تم بابو لوگ ہمارے کیمپ میں ڈیرا لگاؤ۔ روٹی ہم دے گا۔ کدو خود پکاؤ۔ مسالا گھی بھی ہم دے گا۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"کدو کدھر سے آئے گا؟"

"کدو جتنا چاہو۔ فکر نہ کرو۔"

خان چلا گیا تو داستان گو نے کہا "یہاں تو گھاس کا پتّا نظر نہیں آتا۔ کدو؟ اور پھر جتنا چاہو؟"

"یار، اس نے دریا کی طرف اشارہ کیا تھا" انجینئر ہنسا۔

"بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ چلو، دریا کا جائزہ لیں" لیڈر نے کہا۔

دریا کیمپ کے پیچھے تقریباً تین منزلیں نیچا تھا۔ اُدھر پتھروں پر ریت کے تودے لگے ہوئے تھے۔ جلی ہوئی چٹانوں کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ پھر بدبو کا ایک ریلا آیا۔

"ارے!" ورٹ بولا "یہاں تو خالص کھاد کا ڈپو معلوم پڑتا ہے۔ ذرا دیکھو تو۔"

دیکھا تو فضلے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

"لو بھئی" ورٹ چلایا "کھاد ہے تو کدو بھی ہو گا۔"

دریا کے پاٹ پر موٹی ریت کی بیچ بچھی ہوئی تھی۔ سامنے ٹیلوں کی چوٹیوں پر جگہ جگہ ریت بچھی ہوئی تھی۔

"کمال ہے!" ڈرائیور نے کہا "پہاڑ کی چوٹیوں پر صحرا۔ ریت ہی ریت ——— ریت ہی ریت۔"

"ہاں، یار۔ یہ عجب بات ہے!" لیڈر نے جائزہ لیا۔

"ایوولیوشن تو ٹھیک ہے، یار۔ مگر کدو؟" شاعر بولا۔

"ارے! سانپ!" لیڈر بولا۔

دیکھا تو ہمارے قریب ہی ایک دو گز لمبا بھورا سانپ جا رہا تھا۔

سب اُٹھ کر بھاگے۔ ورٹ سب سے آگے تھا۔

"بڑا بڑا سانپ ہے یہاں تو" انجینئر بولا۔

"یہاں سانپ نہ ہو گا تو کیا ہو گا۔ یہ پتھریلے پہاڑ، ریت کے تودے اور دریا"

www.kmjeenovels.blogspot.com

ڈرائیور نے کہا۔

"ہاں، یار۔ جبھی اِدھر دریا کی طرف کوئی نہیں آتا" لیڈر بولا۔

"مل گیا! مل گیا!" وٹ کی آواز آئی۔

اُوپر کیمپ کے قریب وٹ کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا "مل گیا! بھئی، مل گیا!"

"کیا ملا؟ سانپ؟" شاعر نے پُوچھا۔

"نہیں، یار، کدُو" وٹ بولا۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک لمبی سی نالی میں، بیل پر پندرہ بیس کدُو لگے ہُوئے تھے۔

"یار اتنے بڑے کدو!" لیڈر نے حیرت سے کہا۔

"یہ مٹی میں نہیں اُگے ہُوئے۔ خالص فضلے کی پیداوار ہیں" وٹ ہنسا "بڑے تو ہوں گے"۔

اب سوال یہ تھا کہ کدُو پکائے گا کون؟

"لو، کدو پکانے میں کیا مشکل ہے۔ اور پھر یہ کدُو۔ خاص کھاد میں اُگا ہُوا کدو۔ بس ہنڈیا میں ڈالو اور پھر ہنڈیا اُتار لو۔ اللہ اللہ خیر سلا" وٹ نے کہا۔

"تو پھر یار، تم ہی پکا دو" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"وہ رہا، باورچی خانہ" داستان گو بولا۔

وٹ دو منٹ کے بعد باورچی خانے سے باہر نکل آیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"کیوں؟ کیا ہُوا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے۔ بس پکا لیا کدو" انجینئر ہنسنے لگا۔

"نہ بھئی نہ" وٹ نے کہا "کدو پکانا تو مشکل نہیں، لیکن اس باورچی خانے

www.kmjeenovels.blogspot.com

میں کھڑا ہونا دل گردے کا کام ہے۔ اندر جاؤ تو دم گھٹتا ہے۔"

"اور وہ جولانگری اندر کام کر رہا ہے؟" داستان گو نے پوچھا۔

"پسینے کا فوارہ چل رہا ہے۔ ہانڈی میں پانی ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں" وٹ بولا۔

"اچھا، بھئی۔ میں تو چلا" ڈرائیور نے کہا "جب تک میں خیمے لگالوں باہر میدان میں۔"

جب ہم خیمے لگا رہے تھے تو چینی کیمپ میں سے کسی کی نگاہ پڑ گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سات آٹھ چینی ہمارے اردگرد آ کھڑے ہوئے۔ وہ بڑے غور سے خیموں کو دیکھنے لگے۔ نائیلون کی رسیوں کا معاینہ کرنے لگے۔

وہ خیموں کو غور سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ان کی چی چی چو چن چو سے سارا گردوپیش بھر گیا۔

"یار، یہ تو چڑیاں بول رہی ہیں" وٹ نے کہا۔

"بولنے دو" شاعر ہنسا۔

قریب ہی سے حوالدار کی آواز آئی "کوئی نئی چیز ہو، یہ چینی اسے دیکھ دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ نئی مشین پر تو مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہیں۔"

"حوالدار، آپ ان کی بات سمجھتے ہیں کیا؟" داستان گو نے پوچھا۔

"ہمارے پلّے تو کچھ نہیں پڑتا، ہاں، اشاروں سے چھوٹی موٹی بات کر لیتے ہیں" حوالدار نے جواب دیا۔

خیمے گاڑنے کے بعد ہم نے باہر زمین پر بستر بچھائے اور لیٹ گئے۔ چار خیموں میں، تین باہر۔ اس وقت شام پڑ چکی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود پہاڑوں سے بھڑاس نکل رہی تھی۔ خنکی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"حوالدار صاحب، یہ جگہ اتنی گرم کیوں ہے؟" انجینئر نے پوچھا۔

"یہ تو جہنم ہے، صاحب، جہنم" حوالدار بولا "یہاں دن اور رات میں کوئی فرق

www.kmjeenovels.blogspot.com

نہیں پڑتا۔ رات کے دو بجے جب پہاڑ ٹھنڈے پڑتے ہیں تو گرم لُو کی آندھی چلنے لگتی ہے۔"

"رات کے دو بجے گرم لُو؟" لیڈر نے کہا "وہ کس اصُول کے تحت؟"

"یہاں اصُول نہیں چلتے، صاحب" حوالدار نے کہا "گرم بگولے چلتے ہیں۔ ایک دن کے وقت، چار پانچ بجے، دُوسرا رات کو، دو تین کے قریب۔ ان بگولوں میں گرمی ہوتی ہے، اور ریت۔ مینلا سے لے کر چلاس تک ریت اُڑتی ہے۔ ساتھ چمک اور کڑک بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار چار بوندیں بھی پڑ جاتی ہیں تو ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔"

"یہاں سانپوں کی افراط ہے کیا؟" انجینئر نے پُوچھا۔

"سانپ تو ہیں۔ بہُت ہیں۔ اُدھر دریا کی طرف" حوالدار بولا "زہریلے بھی ہیں۔ پر اُدھر نہیں آتے۔"

"اُدھر کیوں نہیں آتے؟" داستان گو نے پُوچھا۔

"کیسے آئیں؟ موسم کی وجہ سے سر چھپائے پھرتے ہیں، بگولوں میں ریت کی وہ مار پڑتی ہے کہ آنکھیں نہیں کُھلتیں۔ پھر اُوپر سے گرمی۔ اور صاحب، کھانے کو یہاں ہے کیا؟ نہ چُوہا، نہ مینڈک سب بے چارے بُھوک کے ہاتھوں تنگ ہیں۔"

زندگی کا راز

شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"تم ہنستا ہے، بابُو" حوالدار بولا "یہاں آٹھ دن رہو تو سمجھ میں آ جائے۔ جو ہم یہاں دو سال سے بیٹھا ہے اس جہنم میں۔"

"خان" ایک ٹرک ڈرائیور بولا "تو دو سال کی بات کرتا ہے، ام دس سال

www.kmjeenovels.blogspot.com

سے اس سڑک پر چل رہا ہے۔ ہاں۔"

"تم چل رہا ہے، بیٹھا نہیں" خان بولا "بیٹھنے اور چلنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"دیکھ، خان" ٹرک ڈرائیور نے حوالدار کو چھیڑا "جو جینا سیکھنا ہے تو چلنا سیکھو۔ ہم تو کہتا ہے، بابو، جو جینا سیکھنا ہے تو پہلے ٹرک چلاؤ۔ دو سال ٹرک چلاؤ تو پھر تم زندگی کر سکتے ہو۔ پھر کچھ فکر نہیں۔ غم تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ خوشی تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گی۔ دال کھاؤ گے تو یوں لگے گی جیسے پلاؤ ہو۔ کپڑا اچھا ہو، بُرا ہو، نیا ہو، پُرانا ہو۔ کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ گرمی ہو یا سردی۔ برف پڑ رہی ہو۔ پڑی پڑے۔"

"تم کب سے اس سڑک پر چل رہے ہو؟" شاعر نے پوچھا۔

"اپنی تو ساری زندگی ہی اسی سڑک پر گزری ہے۔ پہلے کلینر تھا، پھر ڈرائیور بن گیا۔ اب مالک ہوں، ٹرک کا۔"

"کسی اور سڑک پر کیوں نہیں چلتے؟" وٹ نے پوچھا۔

"اس سڑک کو چھوڑ کر کون جائے" ٹرک ڈرائیور ہنسا۔

"کیوں؟ اس سڑک میں کیا ہے؟" شاعر نے پوچھا۔

"اس سڑک میں بارہ سواد ہیں، بابو" ٹرک ڈرائیور ہنسا۔

"جہنم ہے، جہنم" خان غصے سے چلّایا۔

"جہنم بھی ہے، بہشت بھی ہے، حوالدار۔ ٹرک ڈرائیور جہنم اور بہشت دونوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اب دیکھ لو، سڑک چلتی رہے تو ٹھیک، رُک جائے تو ٹھیک۔ سب اچھا۔ دس دس دن رُکے رہتے ہیں، پر کبھی ملال نہیں آیا۔ دل میلا نہ ہوا۔ راشن ہو تو پراٹھے کھاتے ہیں، مرغی پکاتے ہیں۔ نہ ہو تو چنے چبا کے پانی پیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ بس بابو، یہی بھید ہے زندگی کا۔ دل تنگ نہ کرو۔ بس اتنی سی بات ہے۔ جو ہے اسے قبول کرو۔ جو نہیں، اُس کے خواب نہ دیکھو۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"بالکل یار!" داستان گو بولا "تُو نے صوفی کا بھید پالیا۔"

"صوفی ووفی کا تو اپنے کو پتا نہیں" وہ بولا "نہ ہی ولی کا پتا ہے۔ اور پتا لگا کر کرنا بھی کیا ہے؟" وہ اُٹھ بیٹھا "اچھا، حوالدار۔"

"کیسے آیا تھا؟" حوالدار نے پُوچھا۔

"اِدھر پانی لینے آیا تھا۔"

"نیند نہیں آئی کیا؟"

"تاش کی بازی چل رہی ہے" وہ بولا۔

"اس اندھیرے میں؟"

"لال ٹینیں جو ہیں۔"

"اور گرمی؟ اس گرمی میں تو جان نکل رہی ہے" لیڈر نے کہا۔

"بابو، اپنی جان تو کب سے نکل چکی۔ سالی نکل گئی تو سکھی ہو گئے۔ ایک یہ حوالدار ہے کہ جان کو یوں مٹھی میں دبائے ہوئے بیٹھا ہے جیسے ہاتھ کا بٹیرا ہو۔ سالی کو نازنعمت میں رکھو تو سر پر چڑھ جاتی ہے۔ عذاب بن جاتی ہے" وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

"یار" انجینئر بولا "کیا بات کر گیا ہے، یہ ٹرک ڈرائیور!"

"ان کی بات نہ سنو، صاحب" حوالدار بولا "ان کا کیا اعتبار۔ آج یہاں، کل وہاں۔ پہیئے کی کمائی کھاتے ہیں۔ پہیئے پر چڑھے رہتے ہیں۔ جگہ جگہ کا پانی پیتے ہیں۔ ان کا کیا بھروسا۔"

گرمی کی وجہ سے رات بھر ہمیں نیند نہ آئی۔ پھر تیسرے پہر آندھی چلنے لگی، اور ہم نے منھ سر چادر میں لپیٹ لیا۔

چینی کیمپ

چینیوں کا کیمپ، بالکل ایسا تھا جیسے شہد کی مکھیوں کا گھر ندا ہوتا ہے۔ ہر تفصیل

www.kmjeenovels.blogspot.com

سوچی سمجھی ہوئی تھی۔

چینی ایسی جگہ کیمپ لگاتے ہیں جہاں پانی وافر ہو، اور وہ پانی چشمے کا ہو۔ دریا یا نالے کا نہیں۔ پہلے پانی کا معاینہ کرتے ہیں کہ صحت کے لیے موافق اجزا موجود ہیں یا نہیں۔ پھر بلندی پر کسی محفوظ جگہ ربڑ کی موٹی سی نال لگا دیتے ہیں اور بڑے بڑے بانسوں کی مدد سے نال کو سہارا دے دے کر کیمپ تک پہنچا دیتے ہیں۔ کیمپ میں پہنچ کر نال کا پانی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک پینے کے لیے، دوسرا برتنے کے لیے۔

پینے کا پانی سیدھا ایک حمام میں اکٹھا ہو جاتا ہے، جس کے نیچے ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔ وہاں سے پانی کچن میں جاتا ہے اور باہر ایک ٹونٹی پینے کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ چینی ٹھنڈا نہیں، گرم پانی پیتے ہیں۔

جب وٹ نے یہ سنا تو وہ چیخ اٹھا "نہیں، یار۔ میں نہیں مانتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اتنی سمجھ دار قوم اور ایسی حماقت کرے! بھلا گرم پانی پینے کی تک ہے کوئی؟"

"پی کے دیکھو تو پتا چلے" انجینیر بولا "پیٹ نہیں بڑھتا۔ جراثیم مر جاتے ہیں، معدے میں گڑبڑ نہیں ہوتی۔ بار بار پیاس نہیں لگتی۔"

"ہٹاؤ، یار" شاعر بولا "ہمیں دنیا بھر کی بیماریاں منظور ہیں، لیکن پینے کو ٹھنڈا پانی ملے۔"

نالے پر چینیوں نے ایک عام چوبچہ بنا رکھا تھا۔ اس چوبچے سے ایک دھارا بہتا تھا۔ دھارے کے سامنے ایک چھوٹی سی پن چکی لگی ہوئی تھی۔ اگر دھارا پن چکی کے پروں پر ڈال دیا جاتا تو دو چھوٹے چھوٹے پتھر کے پاٹ گھومنے لگتے۔ غالباً یہ آٹا یا چاول پیسنے کی مشین تھی۔

کیمپ میں ایک جنریٹر لگا ہوا تھا جو بجلی پیدا کرتا تھا۔ اس بجلی سے چھوٹے چھوٹے قمقمے روشن ہو جاتے۔ لیکن سارے کیمپ میں کوئی بجلی کا پنکھا نہ تھا۔

خیمے موٹے اور دوہری کینوس کے بنے ہوئے تھے، جو چاروں طرف سے بند تھے۔ پہلو

www.kmjeenovels.blogspot.com

میں صرف ایک جالی دار کھڑکی تھی۔ خیمے کو دیکھ کر ہی شدّت سے گرمی لگنی شروع ہو جاتی۔ ان خیموں میں چینی قمیص اُتار کر ہلکی نکریں پہنے بیٹھے رہتے تھے۔ کھانے کے وقت گھنٹی بجتی اور وہ اپنی اپنی بالٹی اُٹھا کر لائن میں جا لگتے۔ صبح کے وقت کالی کالی کھیر سی کھاتے اور دوپہر کو چاول۔

چینی کیمپ کی ایک خصوصیت بڑی عجیب تھی۔ وہ گروپوں میں کام کرتے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں سڑک پر کھڑے ہو کر بلاسٹنگ کرتے۔ پھر سڑک کے پتھروں کو مشین سے ہموار کرتے۔ پھر خود ہاتھوں سے پتھر سڑک پر جماتے۔ لیکن اس دوران میں دیکھنے والے کو پتا نہ چلتا کہ کون کام کروا رہا ہے اور کون کام کر رہا ہے۔

کیمپ میں بھی ایک کڑا انتظام رائج تھا۔ لیکن پتا نہیں چلتا تھا کہ نظام کون چلا رہا ہے۔ عمل درآمد کی ذمّے داری کس کے سر پر ہے۔ لباس، انداز، طور طریقے سے وہ سبھی ایک سے نظر آتے تھے۔ نہ کوئی حاکم تھا، نہ محکوم۔ کیمپ میں کوئی خصوصی خیمہ نہ تھا جس سے پتا چلتا کہ یہ ناظم کا ہے۔

اس بات پر روٹ بڑا خشمگیں ہوا "لو، کوئی بات ہے،" وہ بولا "یہ اپنے حوالدار ہی کو دیکھ لو۔ ایک میل دُور سے دیکھو تو بھی صاف پتا چل جاتا ہے کہ یہ حوالدار ہے، اور باقی سپاہی ہیں۔"

"بالکل پتا چل جاتا ہے،" شاعر بولا۔

"ہر وقت اس کا ہاتھ مونچھ پر رہتا ہے" ڈرائیور بولا۔

"ہاتھ مونچھ پر نہ ہو، تب بھی پتا چل جاتا ہے" لیڈر نے کہا۔

"لیکن،" روٹ چلّایا "ان چینیوں کا پتا ہی نہیں چلتا کہ کون حوالدار ہے، کون سپاہی ہے۔ خوامخواہ خلقِ خدا کو کنفیوز کرتے ہیں۔"

چینی کیمپ میں ہر وقت ریڈیو لگے رہتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ کیمپ میں

www.kmjeenovels.blogspot.com

ایک بہت طاقت ور ریسیور لگا ہوا تھا، جہاں سے ہر خیمے میں تار فٹ کر کے لاؤڈ سپیکر لگائے ہوئے تھے۔ صبح سویرے ہی چینی ریڈیو کی آوازیں کان میں پڑتیں۔

پہلی بار انھیں سن کر لیڈر گھبرا گیا۔ دوڑا دوڑا آیا۔ کہنے لگا "یار، تم تو کہتے تھے چینی کیمپ میں کوئی لڑکی نہیں"۔

"تو کیا غلط ہے؟" شاعر نے پوچھا۔

"ہاں، غلط ہے" پھر وہ قریب ہو کر زیرِ لب بولا "کیمپ میں ایک لڑکی ہے۔ سالوں نے اسے چھپا کے رکھا ہوا ہے"۔

"تم نے اسے دیکھا ہے کیا؟" انجینئر نے پوچھا۔

"دیکھا تو نہیں" لیڈر بولا۔

"ہاں" داستان گو مسکرایا "میں نے بھی اسے روتے ہوئے سنا ہے۔ ہر خیمے کے لاؤڈ سپیکر سے اس کی آوازیں آتی ہیں"۔

"ارے بھائی، وہ تو ان کا ریڈیو ہے۔ کوئی گا رہی ہو گی" انجینئر بولا۔

"اس طرح چیخیں مار مار کر گاتے ہیں کیا؟" لیڈر نے غصے سے کہا۔

"کل دو چینی ٹرک ڈرائیوروں کے اڈے پر پہنچے ہوئے تھے۔ ٹرک ڈرائیور ان سے چہلیں کر رہے تھے۔ ایک نے تو گال تک سہلائے۔ اس پہ چینی طیش میں نہیں آئے بلکہ مسکرانے لگے" وٹ نے کہا۔

"یہ جو کام کر رہے ہیں، بہت چھوٹی عمر کے لڑکے ہیں" لیڈر بولا۔

"ہاں، ہاں۔ کھیلنے کودنے کے دن ہیں" داستان گو نے کہا۔

چینیوں کی ایک خصوصیت حیران کن تھی۔ اگرچہ وہ خود سڑک بنا رہے تھے، ساری ذمّے داری ان کے سر پہ تھی، اس کے باوجود وہ انتظامی امور میں قطعی دخل نہیں دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ہر چینی کیمپ کے ساتھ ایک پاکستانی یونٹ منسلک تھا۔ یہ

www.kmjeenovels.blogspot.com

فوجی یونٹ پبلک سے رابطہ رکھتا تھا اور پاکستانی حکومت کے احکامات بجا لاتا تھا۔ چینیوں کا کام صرف سڑک بنانے تک محدود تھا۔

جہنّم

اس جہنّم میں ہم تین دن رُکے رہے۔ وہ صبح شام بھی عجیب صبح شام تھے۔ صبح سات بجے سے نو بجے تک اور رات کو نو بجے سے گیارہ بجے تک، صرف چار گھنٹے کے لیے، اس تندور کی آگ میں کچھ تخفیف ہو جاتی۔ باقی وقت سورج سر پر آکر یوں بیٹھ رہتا جیسے کُلاہ ہو، اور پھر ہم سائے کے لیے تڑپتے۔

ان پہاڑوں میں کوئی ایسی کھوہ بھی نہ تھی جہاں کڑکتی دھوپ میں سر چُھپایا جا سکتا۔ کوئی ٹُنڈ مُنڈ درخت بھی نہ تھا۔ لہٰذا مجبوراً ہم نالے کے چوبچے میں جا کھڑے ہوتے۔ جب بھی دھوپ ناقابلِ برداشت ہو جاتی تو چوبچے میں ڈبکی لگا لیتے۔

اگر ٹرک ڈرائیور بھی ہماری طرح نالے میں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیتے تو پھر مشکل ہو جاتی۔ نالے کے چوبچے میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ دس بیس افراد نہا سکتے تھے۔ وہاں ایک سو پچاس آدمیوں کی گنجائش نہ تھی۔

ٹرک ڈرائیور باری باری نالے پر آتے، ڈبکی لگاتے اور پھر اپنے اپنے ٹرک تلے لیٹ کر سو جاتے۔ اس لیے نالے میں مستقل طور پر رہنے والے صرف ہم سات تھے۔

ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد سڑک سے اعلان سنائی دیتا "بلاسٹنگ، بلاسٹنگ"۔ ایک چینی دھوپ میں دوڑا دوڑا آتا "بلاسٹن، بلاسٹن"۔ اس پر نالے پر کھڑا سنتری شور مچا دیتا "خلاص، خلاص"۔ اور ہمیں مجبوراً نالے سے نکل کر سڑک پر جیپ کی اوٹ میں کود لینا پڑتا۔۔۔ وہاں دھوپ میں کھڑے کھڑے ہمارا مُربّا بن جاتا۔

بلاسٹنگ ختم ہوتی تو ہم دوڑے دوڑے نالے پر پہنچتے اور پانی میں ڈبکیاں

www.kmjeenovels.blogspot.com

لگاتے۔ بیس پچیس منٹ کے بعد پھر سے اعلان ہوتا: بلاسٹنگ، بلاسٹنگ۔ سنتری "خلاص، خلاص" چلاتا۔ اور ہمیں پھر سے چلچلاتی دھوپ میں کور لینا پڑتا۔

"یار، یہ اچھی پریڈ ہو رہی ہے" اپنی" وٹ چلاتا۔

"اپنا تو وہی حال ہو رہا ہے جو ٹینس کورٹ میں بال کا ہوتا ہے" شاعر ہنسا۔

"یار، کچھ کرنا چاہیے" لیڈر نے کہا۔

اس سنتری کو رام کر لو۔ کم از کم دوڑ بھاگ سے تو نجات ملے گی" انجینئر نے مشورہ دیا۔

سنتری کو بھی ہم سے بہت ہمدردی تھی، لیکن وہ بے چارہ مجبور تھا کیونکہ چینی ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتے تھے۔ پھر ایک ٹرک ڈرائیور آکر کہنے لگا "خو، بابو۔ کیوں خواہ مخواہ گرمی سردی کے چکر میں پڑا ہے۔ تاؤ کھا جائے گا تو تین مہینے چارپائی پر پڑ جائے گا"

"وہ کیا ہوتا ہے تاؤ؟" وٹ نے پوچھا۔

"دیکھو، بابو۔ تم اِدھر ٹھنڈے پانی میں ڈبکی لگاتا ہے، پھر اُدھر سڑک پہ دھوپ میں ہو کر کور لیتا ہے۔ پھر اِدھر آتا ہے۔ پھر اُدھر جاتا ہے۔ اس سردی گرمی سے تاؤ لگ جائے گا" ٹرک ڈرائیور بولا۔

"تو پھر کریں کیا؟" شاعر نے پوچھا۔

"اُدھر الائچی نالے میں جا کر چھپ جاؤ" ڈرائیور نے ہمیں آنکھ ماری۔

الائچی جھاڑیاں

"اُدھر کوئی اور نالا بھی ہے کیا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ہاں۔ آگے سڑک پر۔ ایک فرلانگ دُور" ٹرک ڈرائیور نے زیرِ لب کہا۔

جب ہم الائچی نالے پر پہنچے تو بے حد مایوس ہوئے۔ وہ نالا نہیں تھا بلکہ نالی تھی۔

نہ چوبچہ، نہ دھارا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ارے!" دفعتہً ڈرائیور چلّایا "وہ دیکھو، وہ۔"

ہم نے اُوپر دیکھا تو حیران رہ گئے!

نالے کے اُوپر، ایک بڑے سے میدان میں، گہرے سبز رنگ کی چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔ بالکل اس طرح جس طرح بڑے ہوٹلوں کے لان میں شام کے وقت رنگ دار چھتریاں لگا دی جاتی ہیں۔

اُوپر گئے تو دیکھا کہ وہ جھاڑیاں تھیں۔ سارے میدان میں تقریباً بیس پچیس سبز جھاڑیوں کے جُھنڈ تھے۔ پتّے بے حد سرسبز تھے۔ شاخیں خشک اور یوں مُڑی تڑی ہوئی تھیں جیسے پُرانی رسّیاں ہوں۔ نیچے رسّیاں ہی رسّیاں تھیں، اُوپر جھاڑ دار پتّے۔ چار چار پانچ پانچ جھاڑیوں کا جُھنڈ چھتری کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔

ایک چھتری کے نیچے چھ ٹرک ڈرائیور بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ دوسری چھتری تلے چار آدمی سوئے ہوئے تھے۔ تیسری خالی تھی۔ ہم اندر رکڑوں داخل ہوئے۔ وہاں صرف لیٹنے یا بیٹھنے کی جگہ تھی۔ عجیب سی خنکی تھی وہاں۔

"واہ، بھئی واہ! کیا جگہ ہے!" لیڈر بولا۔

"ہم تو بھُولے ہی رہے۔ اس سائے کا تو جواب ہی نہیں۔"

"یار، یہ کیا الائچیوں کی جھاڑیاں ہیں؟" وٹ نے پُوچھا۔

"خوشبو تو الائچیوں کی ہی آرہی ہے" شاعر بولا۔

"بھئی، الائچی نالا جو نام ہے تو ضرور یہ الائچیوں کے پیڑ ہی ہوں گے" لیڈر بولا۔

"لیکن کوئی الائچی نظر نہیں آتی" انجینئر نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ الائچیوں کے پیڑ ہوں اور الائچی نہ لگی ہو؟" ڈرائیور بولا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا تم نے مری کے راستے پر زیتون کے پیڑ نہیں دیکھے؟" داستان گو بولا "اتنے سرسبز پیڑ ہیں کہ سبحان اللہ! لیکن گزشتہ نو سال سے پھل نہیں لگا۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"آب و ہوا موافق نہیں آئی ہوگی" ڈرائیور بولا۔

"میں نے ایکسپرٹس سے بات کی ہے" داستان گو نے کہا "وہ کہتے ہیں، پھل اس لیے نہیں لگ رہا کہ پودوں کو آب و ہوا ضرورت سے زیادہ موافق آ گئی ہے۔ اس لیے پودے پل رہے ہیں، پھل نہیں دے رہے۔"

"یہ کیسی دلیل ہے؟" لیڈر نے غصے میں کہا۔

"وہ کہتے ہیں، پھل دار درخت کی بات الٹی ہے۔ اگر پودا روکھا سوکھا رہے تو پھل آتا ہے۔ اگر پودا پل کر بڑا ہو جائے تو پھل نہیں آتا" داستان گو نے کہا۔

"ارے او بے وقوفو! نالائقو!" میں غصے میں چیخنے لگا "دو دن مسلسل گرمی کھانے کے بعد ہمیں یہ الائچی نالے کا ٹھنڈا ٹھنڈا سایہ دستیاب ہوا ہے۔ ان سبز چھتریوں کی لذت کے بجائے، اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے، تم یہ جھگڑا لے بیٹھے ہو کہ ان جھاڑیوں پر الائچیاں کیوں نہیں لگتیں۔ یار، تم واقعی سچے اور کھرے دانش ور ہو۔"

"ہاں، یار۔ ٹھیک کہتا ہے یہ" وٹ بولا۔

"چلو، اب دو منٹ کی خاموشی سادھ کر شکر ادا کرو" شاعر نے ہنس کر کہا۔

"ابھی آدھ منٹ ہی گزرا تھا کہ بلاسٹنگ بلاسٹنگ کی آواز آئی۔

"ابے احمقو! وٹ چلایا "ہمیں شکریہ تو ادا کر لینے دو۔ پھر بلاسٹنگ کرنا۔"

"خلاص، خلاص"، سنتری چلایا۔

"جا، جا بے" تاش کھیلنے والے ٹرک ڈرائیوروں نے سنتری کو ڈانٹا "بڑا آیا ہے بلاسٹنگ کا چچا"۔ سنتری ان کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"دیٹ اِز دی سپر ہٹ" شاعر نے تالی بجائی۔

"ہم بھی یہاں سے نہیں ہٹیں گے" لیڈر بولا۔

اتنے میں دو چینی آ گئے "چائیں چائیں چو چن چو" وہ چلائے۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"بالکل درست کہتے ہو" انجینئر بولا "ہم یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔"

چینی ہماری چھتری کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُدھر ٹرک ڈرائیور چلاّئے کہ سنتری انھیں سمجھاؤ۔ جب قضا آئے گی تو کوئی روک نہیں سکے گا۔ اگر پتھر لگنا ہے تو لگنا ہے۔

"ہاں" دوسرا بولا "وہ عجب خان ٹرک تلے لیٹا ہُوا تھا۔ پتھر ٹرک کی چادر توڑ کر اس کے سر پہ جا گرا۔ بے چارہ مر گیا۔ خو، یہ تو نصیب کی بات ہے۔"

"اونہوں۔ چینی یہ بات نہیں سمجھتا" سنتری بولا "یہ چینی لوگ نصیب کو نہیں مانتا۔ تم ادھر سے خلاص کرو، بائی۔ جلدی۔"

لیکن ہم ڈھیٹوں کی طرح چھتری تلے پڑے رہے۔

ہر چند منٹوں کے بعد چینی چلاّ کر چیں چیں کرتے اور پھر خاموشی سے ہمیں گھورنے لگتے۔

"ارے، یار" شاعر بولا "یہ تو لگا ہوں کی چاند ماری کرتے ہیں۔"

"ان کی خاموشی تو خود پتھر کی طرح بوجھل ہے" لیڈر ہنسا۔

ہم چینیوں کی اس چاند ماری کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے، اور مجبوراً اُٹھ کر ٹیلے سے نیچے اُترنے لگے۔ ٹرک ڈرائیور بھی گالیاں دیتے ہُوئے بھاگ رہے تھے۔

جب بلاسٹنگ ختم ہُوئی تو انجینئر بولا "یارو، وہیں چلتے ہیں، الاچی نالے کی چھتریوں تلے۔"

"ہٹاؤ، یار" ڈرائیور نے کہا "جب تک ہم وہاں پہنچیں گے تو پھر بلاسٹنگ بلاسٹنگ ہو جائے گا۔"

"ہاں، یار۔ اتنی دُور جانے کا فائدہ؟" وہ چلاّیا۔

منقار زیرِ پر

تین دن ہم الاچی نالے پر پڑے رہے۔ کبھی نالے کی طرف بھاگتے، کبھی

www.kmjeenovels.blogspot.com

کوزہ لینے جیپ کی طرف دوڑتے۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ ہمارے دماغ دھواں دے رہے تھے۔ جسم تپ رہے تھے۔ مزاج چڑچڑ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وٹ مزاح کی بات کرتا تو لیڈر غصے سے لال پیلا ہو جاتا "خبردار! جو وِٹ کی بات کی تو۔ میں تمھیں اٹھا کر نیچے کھڈ میں پھینک دوں گا۔"

"بالکل ٹھیک ہے" شاعر کہتا "اس احمق کو اتنا بھی پتا نہیں کہ ہنسی مذاق کی بات پُرسکون فراغت میں چلتی ہے، ان حالات میں نہیں۔"

اُدھر داستان گو غصے میں کھول رہا تھا "یار، یہ بتاؤ کہ ہم میں سے وہ کون تھا جس نے کہا تھا کہ شاہراہِ ریشم مخملی سڑک ہے؟"

انجینئر کہہ رہا تھا "کیوں نہ ہم یہیں سے واپس ہو جائیں؟"

ڈرائیور چلّاتا "فی الحال تو آندھی کی بات کرو، بھائی۔ تین بج گئے ہیں۔ اب بگولا چلے گا۔"

بگولے کا نام سن کر ہمارے دل بیٹھ جاتے۔ جب بگولا چلتا تھا تو ہمارا دم گھٹنے لگتا۔ جسم پر گرم ہوا کوڑے برساتی۔ جی چاہتا کہ موٹے گرم کپڑے لپیٹ کر خود کو ان کوڑوں سے محفوظ کر لیں۔ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی ہم بہت دُکھی تھے۔ چائے پینے کو جی چاہتا۔ بڑی شدّت سے جی چاہتا۔ لیکن پہلا گھونٹ بھرتے تو جی متلانے لگتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کانٹے نگل گئے ہوں۔ رہا کھانا تو پہلے دن تو کدو ہم نے بڑے شوق سے کھایا تھا۔

"یار، اتنا اچھا! اتنا نرم کدو!"

"بھئی، مٹی کا کدو نہیں، خالص کھاد کا کدو ہے۔"

لیکن دوسرے دن وٹ چیخنے لگا۔ بولا "آہاہا! کتنا نرم ہے۔ بالکل حلوے کی طرح۔ اور کتنا اچھا ہے۔" پھر وہ رونی آواز میں چلّایا "یہ کدو ہے۔"

اس کے بعد وہ کدو جو خالص کھاد میں اُگا تھا عام کدو بن کر رہ گیا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

تیسرے دن ہماری کیفیت یہ ہوگئی کہ بات بات پر ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ ایک دوسرے کی بات ہمیں بُری لگنے لگی۔ شاعر کے قہقہے میں تلخی اُبھر آئی۔ داستان گو کی داستانیں مدھم پڑتی گئیں۔ ڈرائیور کی ایوولیوشن ریوولیوشن میں بدل گئی۔ اُدھر حوالدار ہمیں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ روٹی پکانے والے لانگری کی نگاہوں میں غیظ و غضب اُبھر آیا۔

اگر ہم ایک دن اور وہاں رُکے رہتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ لیکن ہماری خوش قسمتی کی وجہ سے تیسرے دن شام کے وقت دفعتہً اعلان ہُوا کہ سڑک کھل گئی ہے۔

پہلے تو ہمیں یقین ہی نہ آیا۔ وٹ بولا "یار، ان سے کہو کہ ہم سے مذاق نہ کریں۔"

"ہاں، ہم پہلے ہی جلے بھُنے بیٹھے ہیں" لیڈر بولا۔

پھر حوالدار آ گیا۔ بولا "صاحب راستہ کھل گیا ہے۔"

"اُونہوں۔ اس کا بھی اعتبار نہیں رہا" داستان گو بولا۔

"ہاں، یار۔ یہ تو ہمیں کدو چر سمجھتا ہے نا" شاعر نے کہا۔

"ٹھیک تو ہے۔ روز اس کے دو کدو ضائع ہو رہے ہیں" انجینئر بولا۔

اور آٹے کی بات کرو" داستان گو نے کہا۔

پھر دفعتہً ایک شور اُٹھا۔

ڈیڑھ سو ٹرک سٹارٹ ہو کر گھاؤں گھاؤں کرنے لگے۔

"ارے!" ہم سب اُٹھ کر جیپ کی طرف بھاگے۔ عین اسی وقت بعد دوپہر کا بگولا چلنے لگا۔

جب ہم الاچی نالے سے روانہ ہُوئے تو ساری فضا بگولے کی وجہ سے دھواں دھار تھی۔ ریت اُڑ رہی تھی۔ ہوا چیخیں مار رہی تھی۔ وادی پر خوفناک قسم کی وحشت طاری تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے بھُتنے بیدار ہو گئے ہوں۔ نہ ہم کو

www.kmjeenovels.blogspot.com

اپنے دیس سے نکالنے کے لیے ہمارے پیچھے دوڑ رہے ہوں، اور ہم پر ریت اور پتھر برسا رہے ہوں۔

اس وقت منظر اتنا خوف ناک تھا کہ ہم محسوس کر رہے تھے کہ ہم کوئی قبیح جرم کر کے بھاگ رہے ہیں، اور شیطانی طاقتیں ہمیں بھاگنے سے روک رہی ہیں۔

سڑک پر چینی مزدور ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ساتھ ہی حوالدار حسرت ناک نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ مونچھ پر تھا۔ رسی جلی ہوئی تھی، پر بل بڑھتا جا رہا تھا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

چلاس

آسیب زدہ گھاٹی

الاچی نالہ سے انخلا کی وہ شام میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ چٹیل پہاڑوں سے گھری ہوئی وہ تنگ تاریک گھاٹی۔ وہ تند و تیز جھکڑ جو ریت پچکاری سے گویا ہولی کھیل رہا تھا، اور جس نے فضا کو تیرہ و تار بنا رکھا تھا۔ پھر وہ شام کا دھندلکا جس میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ پہاڑ کدھر ہے اور کھائی کس طرف۔ اُوپر سے سیٹیاں بجاتے ہوئے بھتنے جو اس آسیب زدہ گھاٹی میں ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ اور وہ ڈیڑھ سو ٹرک جو ہمارے عقب میں گھاؤں گھاؤں کر کے چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔

مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کوہستان نہ ہو بلکہ الف لیلہ کا کوہِ ندا ہو۔ کوئی پُراسرار آواز ہمیں پکار رہی تھی اور ہم عالمِ دیوانگی میں، کسی سحر کے زیرِ اثر، موت کی وادی کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔

میں نے دہشت کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ جیپ پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

صدیاں بیت گئیں۔

آخروٹ کی آواز نے وہ دہشت ناک طلسم توڑا "ارے!" وہ چلایا "یہ سڑک کو کیا ہوا؟"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"کیا ہوا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"بھئی، کوئی گڑبڑ ہے" دٹ بولا

"کیسی گڑبڑ؟" شاعر نے پوچھا۔

"بھئی، یہ سڑک تو چلنے لگی ہے۔ باقاعدہ چل رہی ہے۔ وہ دیکھو، سپیڈو میٹر"

اس نے ٹارچ کی روشنی میٹر کی طرف موڑ دی "ہم تو تیس میل کی سپیڈ پہ جا رہے ہیں"

"ہاں، یار۔ سڑک تو پھر سے ریشمی ہو گئی" میں نے کہا۔

"خبردار!" داستان گو غرّایا "خبردار جو کسی نے اس سڑک کو ریشمی کہا۔ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا"

"بالکل ٹھیک ہے" شاعر بولا "اس سڑک کا کوئی بھروسا نہیں"

"سالی کبھی مخمل بچھا دیتی ہے، کبھی کانٹے" دٹ ہنسا۔

"ہنسو نہیں" لیڈر غرّایا۔

"کیوں؟ ہنسیں کیوں نہیں؟" انجینئر بولا۔

"کمینو!" لیڈر نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر ہمیں ڈانٹا "جو جو کچھ تم پر بیتی ہے، اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو یوں کھی کھی نہ کرتے"

"ہاں، بھئی۔ ٹھیک کہتا ہے یہ" شاعر بولا "کم از کم چار ایک دن کے لیے تو ہنسی کافور رہنی چاہیے"

"دقّت یہ ہے" داستان گو نے کہا "کہ تم سب بے غیرت ہو۔ کیوں ڈرائیور؟ یہ بے غیرت ہیں نا؟ غیرت مند صرف ڈرائیور ہے اور میں ہوں"

"یہ کیا کہ رہا ہے، ڈرائیور؟" لیڈر نے پوچھا۔

"خاموش!" ڈرائیور نے وہیل سے مُنھ موڑے بغیر کہا "مجھے نہ بلاؤ۔ میں پھانسی پہ لٹکا ہوا ہوں۔ اس سے زیادہ مشکل ڈرائیونگ نہ میں نے کبھی کی ہے، نہ پھر کبھی موقع ملے گا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

اگر یہاں سے بچ نکلے تو۔"

"ہاں، یار۔ اسے نہ بُلاؤ" لیڈر بولا۔

"اور مجھے بھی نہ بُلاؤ" داستان گو نے کہا۔

"کیوں؟ تو بھی پھانسی پر لٹکا ہُوا ہے کیا؟" انجینئر نے پُوچھا۔

"میں پھانسی پر نہیں لٹکا ہُوا" داستان گو نے جواب دیا "لیکن اگر کسی نے مجھے بُلایا تو میں اُسے پھانسی پر لٹکا دوں گا۔ ڈرو، میرے مُوڈ سے ڈرو۔"

"ہاں، بھئی۔ اس کے موڈ سے ڈرو" وٹ ہنسا "اسے کہتے ہیں غیرت مند موڈ۔"

"ہوٹل آ گیا، ہوٹل۔ سازین کا ہوٹل ـــ رُک جاؤ۔ رُک جاؤ" لیڈر چلّایا۔

ڈرائیور نے اس کی بات اَن سُنی کر دی۔ اُلٹا گاڑی کی سپیڈ تیز کر دی۔

"یہ ہوٹل تھا کیا؟" وٹ بولا۔

"ہوٹل نہیں تو اور کیا تھا؟" لیڈر چلّایا "بھئی، سازین کا ہوٹل تھا۔"

"یہ تو بالکل دم پُخت تھا، جیسے مال خانہ ہو" داستان گو بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مال خانے میں نہ در ہوتا ہے نہ دریچہ" داستان گو نے وضاحت کی۔

"ہاں، یار۔ اس ہوٹل کے باہر برآمدہ بھی تو نہ تھا" شاعر نے کہا۔

"تو پھر یہ ہوٹل کیسے ہو سکتا ہے؟" انجینئر بولا۔

"یار، تم سارے ہی احمق ہو" داستان گو ہنسا "جس علاقے میں دن میں دو بار جھکڑ چلتا ہو، مَنوں ریت اُڑتی ہو، وہاں ہوٹل دم پُخت نہ ہو گا تو کیا بارہ دری قسم کا ہو گا۔"

"ہاں یار۔ بات تو ٹھیک ہے" لیڈر نے کہا۔

مُغلیہ دستر خوان

"چُپ چاپ بیٹھے رہو۔ ایسے مقبرہ نما ہوٹل کے اندر جانے سے تو بھوکا رہنا کہیں

www.kmjeenovels.blogspot.com

بہتر ہے" ڈرائیور بولا۔

یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔

"ہاں، بھئی" ورٹ نے زیر لب کہا "اس ٹرپ کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ ہمیں بھوکے رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔"

"ابے" لیڈر بولا "ایک بار چلاس پہنچ لو۔ ایسا کھانا کھلاؤں گا کہ تمھیں مغلیہ دور کا دستر خوان یاد آ جائے گا۔"

"ہاں، ہاں۔ دیکھو، فی الحال خواب دیکھو۔ مغلیہ دور کے دستر خوان کے خواب دیکھو۔ وقت کٹی کا یہ لاجواب نسخہ ہے" ڈرائیور بولا۔

"کیوں بے، لیڈر؟" انجینئر بولا "تو خواب دکھا رہا ہے ہمیں کیا؟"

"کیوں نہ دکھائے، خواب" شاعر نے کہا "ہر لیڈر کا فرضِ اوّلین ہے کہ قوم کو خواب دکھائے۔"

"وہاں پہنچ گئے، چلاس میں، پھر دیکھنا۔ خواب دکھا رہا ہوں یا حقیقت" لیڈر بولا۔

"وہاں ہے کون جو مغلیہ دور کا کھانا کھلائے گا؟" داستان گو نے پوچھا۔

"میرا ایک دوست ہے" لیڈر نے فخر سے سر اٹھا کر کہا۔

"تیرا دوست مغلوں کا باورچی رہا ہے کیا؟" داستان گو نے پوچھا۔

"میرا دوست ہیڈ ماسٹر ہے" لیڈر بولا "ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر۔"

شاعر قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا "ماسٹر کے پاس بے شک حکومت ہوتی ہے، لیکن کھانے کو روٹی نہیں ہوتی۔"

"تجھے کیا پتا، ان علاقوں میں ماسٹر کس قدر اثر و رسوخ والے ہوتے ہیں" لیڈر نے کہا۔

"اثر و رسوخ والے لوگ تو دعوتیں کھاتے ہیں، کھلاتے نہیں" داستان گو نے جواب دیا۔

"بالکل، بالکل۔ کھلاتے تو وہ ہیں جو اثر و رسوخ والے نہ ہوں" انجینئر ہنسا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"میں کہتا ہوں ہم چلاس جائیں ہی کیوں؟" ڈرائیور بولا۔

"کیا مطلب؟ ظالم، تو نے تو سارا مغلیہ دسترخوان اُلٹ کر رکھ دیا" وٹ چلّایا۔

"یار، چھوڑو" ڈرائیور نے کہا "ہم رات کے دو بجے کے قریب چلاس پہنچیں گے۔ اس وقت خوامخواہ خراب ہوں گے۔ چلو سیدھے گلگت چلتے ہیں۔ صبح سویرے گلگت پہنچ جائیں گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا" لیڈر غصّے میں چیخا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" ڈرائیور بولا "چلاس جانے کے لیے ہمیں شاہراہ سے اُتر کر چار پانچ میل کا چکّر کاٹنا پڑے گا۔"

"یہ اس لیے نہیں ہو سکتا" انجینئر نے کہا "کہ لیڈر کی عزّت پر حرف آتا ہے۔"

"مُغلیہ دسترخوان کو چھوڑ کر جانا کفرانِ نعمت ہے" شاعر ہنسا۔

"دیکھ، لیڈر!" ڈرائیور نے کہا "میں تیرے بھلے کی کہتا ہوں۔ کیوں خود کو امتحان میں ڈالتا ہے تُو؟"

"کیا مطلب؟" لیڈر غرّایا۔

"ہاں، بھئی" وٹ بولا "اپنی عزّت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔"

بل اور بوٹیاں

"روکو! روکو!" لیڈر چلّایا۔

"وہ کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دیکھو۔ برآمدے والا ہوٹل آگیا" لیڈر بولا "وہ دم پُخت قسم کے ہوٹل ختم ہو گئے۔"

"عجب آدمی ہو!" شاعر بولا "ایک طرف چلاس میں مغلیہ دسترخوان کے خواب دکھا

www.kmjeenovels.blogspot.com

رہے ہو، دوسری طرف برآمدے والے ہوٹل پر رُکنے کو کہہ رہے ہو۔"

"ہاں بھئی، یہاں رُک کر کدو گے کیا؟" انجینئر نے پوچھا۔

"روکو! روکو!" لیڈر چلّایا "ورنہ میں چھلانگ لگا دوں گا۔"

"ارے، ارے! وہ چھلانگ لگانے لگا ہے۔" سب چیخنے لگے۔

گاڑی رُک گئی۔ سب اُتر آئے۔

"بول، اب کیا کرے گا؟" شاعر نے لیڈر سے پوچھا۔

"بھئی، بیٹھیں گے، پانی پئیں گے، چائے کا دَور چلے گا، اس بھتنوں کی گھاٹی سے نکلنے کی خوشی میں" لیڈر نے جواب دیا۔

وہ ایک صاف ستھرا اور کھلا ہوٹل تھا۔ سامنے چار ایک ٹرک کھڑے تھے۔ برآمدے میں چھ سات آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ برآمدہ ایک منزل اُونچا تھا۔ قریب ہی ایک نالا بہہ رہا تھا۔

ہوٹل میں ہم سب چارپائیوں پر لیٹ گئے۔

"پانی لاؤ، بھئی، پانی۔"

"لڑکے، جلدی سے چائے بنا دے۔"

"کیوں بھئی، کھانے کو کیا ملے گا؟"

ہر کوئی آرڈر دینے لگا۔

"غلط، بالکل غلط،" لیڈر غرّایا "صرف لیڈر آرڈر دے گا۔ بولو، کیا کھاؤ گے؟"

"کدو" وٹے چلّایا۔ سب قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

"یار، ہنستے کیوں ہو؟ تین روز، صبح شام، کدو کھا کھا کر مجھے کدو کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" وٹے نے خود پر مظلومیت طاری کر کے کہا۔

"صاحب،" ہوٹل والا داخل ہو کر بولا "مرغی کٹوا دوں؟"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ہاں، ہاں۔ کٹوا دو" داستان گو نے کہا "اب بنے گی۔ رات بارہ بجے چڑھنے پر رکھو گے۔ انشاء اللہ صبح سویرے گل جائے گی۔ کھا کر ہم کل دوپہر کو یہاں سے چل پڑیں گے۔ کیوں، لیڈر؟"

"بھئی، مرغی ہے، پائے تو نہیں" شاعر بولا۔

"بھئی، سات ہزار کی بلندی پر بیٹھے ہیں۔ یہاں تو ٹماٹر بھی دو گھنٹے میں گلتا ہے" داستان گو نے کہا۔

"مرغی دکھاؤ، مرغی دکھاؤ" لیڈر چلایا۔

جب ہوٹل والا مرغی لے کر آیا تو سب اُٹھ کر بیٹھ گئے "ارے! یہ مرغی ہے کیا؟"

"لگتا تو شکرا ہے" شاعر نے کہا۔

"اتنی بڑی مرغی!" انجینئر بولا۔

"یہ تو بکرے کی ماں سی نظر آتی ہے" وٹ ہنسا۔

"دیکھو، خان" داستان گو نے کہا "اس مرغی کو ہنڈیا میں ڈالو۔ اس کا شوربا بناؤ۔ پھر شوربا مجھے ڈونگے میں ڈال دو اور بوٹیاں ان سب صاحبوں میں بانٹ دو۔"

"مطلب کیا ہے، تمہارا؟" سب بھنبھنا کر داستان گو کے پیچھے پڑ گئے۔

"مطلب یہ ہے کہ میں تو ویجی ٹیرین ہوں۔ شوربے پہ گزارہ کر لوں گا۔ تم سب گوشت خور ہو۔ تم گوشت کھا لینا۔"

"بالکل غلط" لیڈر چلایا "دیکھو، خان۔ مرغی کاٹو، مسالا لگاؤ اور بھون دو۔ سمجھے؟"

"بالکل ٹھیک" داستان گو نے کہا "پھر بل ہم سے وصول کرو اور بوٹیاں پیچھے آنے والے ٹرکوں کے ڈرائیور کھائیں گے۔"

داستان گو نے سچ کہا تھا۔ جب بھنی ہوئی مرغی سامنے آئی تو سب کے دانت کھٹے ہو گئے۔ ہم نے بل ادا کیا، بوٹیاں پیچھے آنے والے ٹرک ڈرائیوروں کے چھوڑ دیں،

www.kmjeenovels.blogspot.com

اور سفر پہ روانہ ہو گئے

مستقل مہمان

جب ہم چلاس پہنچے تو رات کے دو ڈھائی بجے تھے۔ ہمارے سامنے ایک کھلا ریتلا میدان تھا جس کے ایک طرف چار ایک ٹوٹی پھوٹی دکانوں کا بازار تھا۔

"ارے! یہ ہے چلاس!" وٹ چلایا "اس سے تو وہ ہوٹل ہی زیادہ آباد تھا۔"

میدان میں چارپائی پر سوئے ہوئے ایک شخص کو ہم نے جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھا۔

"کیوں میاں، ہیڈ ماسٹر صاحب کہاں رہتے ہیں؟" لیڈر نے پوچھا۔

اُس نے اُنگلی سے مشرق کی طرف اشارہ کیا، اور پھر لیٹ کر سو گیا۔

ہم مشرق کی طرف چل پڑے۔ بہت دیر میدان میں گھومتے رہے۔ کوئی سڑک نظر نہ آئی تو پھر وہیں آکر اس شخص کو جگایا "میاں، ریسٹ ہاؤس کدھر ہے؟" اس نے اُٹھ کر پھر مشرق کی طرف اشارہ کیا، اور پڑ کر سو گیا۔

ہم پھر مشرق کی طرف چل پڑے۔ اتفاقاً ایک سڑک نظر آئی۔ نیم پختہ اور تنگ۔ دیر تک ہم اس سڑک پر مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر ریسٹ ہاؤس مِل گیا۔ اندر داخل ہوئے تو وہاں کوئی چوکیدار نہ تھا۔ چلا چلا کر ہار گئے۔ آخر کار ایک شخص باہر نکلا۔ بولا "یہاں بالکل جگہ نہیں ہے۔ شور نہ مچاؤ۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

"یہ کون تھا؟"

"اہلکار تو نہیں لگتا تھا۔"

"سلیپنگ سوٹ تو کسی رئیس کا تھا۔"

"انداز غنڈے کا تھا۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک آدمی آگیا۔ کہنے لگا "ریسٹ ہاؤس لگا ہُوا ہے، جی۔"

"کون ٹھہرا ہُوا ہے، اُدھر؟"

"اُدھر افسر لوگ رہتا ہے" اجنبی نے کہا۔

"کتنے دن ٹھہرے گا؟"

"ٹھہرا ہُوا نہیں۔ وہ اُدھر ہی رہتا ہے" اجنبی بولا۔

ہیڈ ماسٹر

ریسٹ ہاؤس سے نکل کر جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو ڈرائیور بولا "دیکھو، تین بج گئے ہیں۔ کیوں ہیڈ ماسٹر کو ڈھونڈنے میں وقت ضائع کر رہے ہو؟ چلو سیدھے گلگت چلتے ہیں۔"

لیڈر تڑپ کر گاڑی سے نیچے اُتر گیا "تم یہاں بیٹھو۔ میں ہیڈ ماسٹر کو تلاش کرتا ہوں۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

"ہاں، پاگل ہو گیا ہوں" لیڈر یوں چلّایا جیسے آسیب زدہ ہو۔

"یار، اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"بھئی عزت کا معاملہ ہے۔ پرسٹیج کا سوال ہے" وٹ زیرِ لب بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ رات کے تین بجے اس تنگ و تاریک سڑک پر کیسے ہیڈ ماسٹر کا گھر ڈھونڈے گا!" ڈرائیور نے کہا۔

"اس کی کوئی بات بھی سمجھ میں آسکی ہے آج تک؟" میں نے کہا "چودہ سال محبوبہ کے رُوبرو بیٹھا رہا۔ سامنے بیٹھ کر روتا رہا۔ لیکن اسے اپنا دُکھ نہیں بتایا۔"

"کمال اس کا نہیں، محبوبہ کا تھا" انجینئر بولا "سالی کو سب پتا تھا۔ لیکن اس نے نہیں جتایا کہ مجھے پتا ہے۔ چودہ سال پوچھتی رہی کہ بات کیا ہے۔"

www.kmjeenovels.blogspot.com

"ایمان سے، کیا عظیم داستانِ عشق ہے" داستان گو بولا "چودہ سال تخلیے میں ایک دُوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے رہے کہ تجھے کیا دُکھ ہے۔"

"واہ وا ! واہ وا !" ڈرائیور بولا "بڑا بڑا کردار پڑا ہے، اللہ کی دُنیا میں۔"

"سبحان اللہ ! عشق بھی کیا رُوپ دھارتا ہے" داستان گو نے کہا۔

"مل گیا ! مل گیا !" دُور سے لیڈر کی آواز آئی۔

"کیا مل گیا، بھئی اِسے ؟"

"ہیڈ ماسٹر کا گھر مل گیا۔"

"اونہوں۔ گھر نہیں گھر کا پتا مل گیا ہوگا۔"

"آجاؤ، آجاؤ" لیڈر کی آواز سُنائی دی۔

سامنے دیکھا تو سڑک کے درمیان کوئی لالٹین جھلا رہا تھا، جیسے ریلوے گارڈ بتی جُھلاتے ہیں۔

"لو بھئی، گھر کا پتا نہیں بلکہ گھر ملا ہے۔"

"وہ کیسے ؟"

"اس لیے کہ لالٹین جُھلائی جا رہی ہے۔"

جب ہم لالٹین کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ لیڈر کے ساتھ ایک شخص ہاتھ میں لالٹین لیے کھڑا ہے۔ ہم گاڑی سے نیچے اُترے تو وہ سب سے باری باری ہاتھ ملانے لگا۔ ہاتھ ملانے کے بعد وہ آگے آگے چل پڑا۔ ہم سڑک سے اُتر کر نجان پر چل پڑے۔ آگے گئے تو چھ نوجوان قطار میں کھڑے تھے۔ انھوں نے باآوازِ بلند السلامُ علیکم کہا اور پھر باری باری ہم سے ہاتھ ملانے لگے۔

"لو، باقی رات تو ہاتھ ملانے میں گزر جائے گی" دٹ زیرِ لب بولا۔

www.kmjeenovels.blogspot.com

"یار، یہ مسلمانی ہم کو بڑی مہنگی پڑ رہی ہے" انجینئر ہنسا۔

"ہاں بھائی، کوئی چائے پانی پوچھو۔ کوئی پھل فروٹ سامنے رکھو۔ یہ کیسی میزبانی ہے کہ ہاتھ ملائے جا رہے ہیں؟" شاعر نے کہا۔

"آج کی رات تو بھئی ہاتھ ملانے پر ہی گزارہ کرو۔ کل دیکھا جائے گا" وٹ بولا۔

"بھئی، مجھے تو صرف ایک عدد چارپائی چاہیے" داستان گو نے کہا۔

"جو چارپائی نظر آئی تو میں تو یار ڈھیر ہو جاؤں گا، وہیں" ڈرائیور نے کہا۔

ہاتھ ملا کر فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہم ایک مرغزار میں کھڑے ہیں۔ نیچے مخملی گھاس کا فرش بچھا ہے۔ چاروں طرف اونچے اونچے چنار کے درخت قطار در قطار کھڑے ہیں، اور قریب ہی بہتے نالے نے بھیرویں کا الاپ چھیڑ رکھا ہے۔

الف لیلوی منظر

"ارے! میرے چٹکی بھرنا" وٹ بولا "میں سو رہا ہوں یا جاگتا ہوں؟"

"یہ وہی چلاس ہے کیا، جہاں ہم آ کے رکے تھے؟" شاعر نے پوچھا۔

"نہیں، نہیں۔ یہ وہ چلاس نہیں۔ وہ تو ایک ویرانہ تھا۔ اور یہ تو الف لیلوی منظر ہے" میں نے جواب دیا۔

"ضرور ہم مر چکے ہیں" وٹ زیر لب بولا "اور مر کر اپنے نیک اعمال کی وجہ سے بہشت میں داخل ہو گئے ہیں۔"

"تشریف لائیے، تشریف لائیے" ایک نوجوان آگے بڑھا۔

"یار، یہ بہشت تو ٹھیک ہے، لیکن یہ غلمان سیکنڈ ہینڈ معلوم پڑتے ہیں" وٹ نے کہا۔

"تشریف لائیے، تشریف لائیے" ہیڈ ماسٹر صاحب لالٹین لے کر آ گئے۔

آگے بڑھے تو لان میں سات آرام کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف دیوان تھا

www.kmjeenovels.blogspot.com

جس پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔

"بیٹھو، یار، بیٹھو" وٹ زیرِ لب بولا "اب سٹیج سٹ ہو گیا ہے۔ اب حوریں آئیں گی۔"

ہیڈ ماسٹر ایک دُبلا پتلا عجز اور اخلاق سے بھرا ہوا آدمی تھا۔ اس کی گفتار میں عجیب شیرینی تھی۔ حرکات میں ٹھہراؤ تھا۔ انداز میں لگن اور محبت تھی۔

جب وہ کچھ دیر کے لیے اندر گیا تو میں نے کہا "میں نہیں مانتا کہ یہ شخص ہیڈ ماسٹر ہے۔"

"مجھے بھی شک پڑ رہا ہے" شاعر ہنسا۔

"کیوں؟" لیڈر غصے سے بولا۔

"نہ اس کے ماتھے پر تیوری ہے، نہ آواز میں تحکم ہے، نہ انداز میں درشتی ہے۔ پھر ہیڈ ماسٹر کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک کہ رہے ہو" شاعر بولا۔

"بھئی، میں نے خود بارہ سال ماسٹری کی ہے" میں نے وضاحت کی "آج ماسٹری چھوڑے تیس سال ہو گئے ہیں لیکن ماتھے کی تیوری ابھی تک نہیں گئی۔ لہٰذا یہ شخص کوئی بہروپیا ہے، ہیڈ ماسٹر نہیں۔"

"بکواس مت کرو" لیڈر غصے سے چلایا۔

"دیکھ، میری جان۔ میں تیرے دوست کی بدتعریفی نہیں کر رہا۔ صرف یہ کہ رہا ہوں کہ وہ حاتم ہو سکتا ہے، صوفی ہو سکتا ہے، سوشل ورکر ہو سکتا ہے، سچا مسلمان ہو سکتا ہے، لیکن ہیڈ ماسٹر نہیں ہو سکتا۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ہیڈ ماسٹر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے وہی چھ نوجوان تھے۔ انھوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے قاب اُٹھائے ہوئے تھے اور میز کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شاعر نے مجھے کہنی ماری۔ کہنے لگا "میں تو سمجھا تھا کہ یہ مُنھ زبانی اخلاق کا پُتلا ہے،

www.kmjeenovels.blogspot.com

لیکن یہ تو عامل نکلا!"

"یار، یہ تو بالکل الف لیلوی منظر ہے!" میں نے کہا۔

"شاہی باغیچہ ہے۔ رات کے تین بجے ہیں۔ دستر خوان چُنا جا رہا ہے۔ غلمان خدمت کے لیے دست بستہ حاضر ہیں۔ مجھے تو شک پڑنے لگا ہے کہ ابھی یہ پُراسرار میزبان حکم دے گا کہ خدام، مہمانوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ۔ ہر قسم کی نعمت ان کے لیے مہیا کرو۔ اور جب یہ سیر ہو جائیں تو ان کے سر قلم کر کے اسی قاب میں رکھ کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔"

میز پر کھانے چُن دیے گئے تو میں نے کانی آنکھ سے دیکھا۔ ان میں چائے تھی۔ بسکٹ تھے۔ کیک تھے۔ کباب تھے۔ انڈے تھے۔ گوشت تھا۔ میٹھا تھا۔ پھل تھے۔ ایسا میز میں نے کبھی نہ دیکھا تھا جس پر بیک وقت چائے، بریک فاسٹ اور ڈنر لگا ہو۔

"یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟" شاعر نے میز کا جائزہ لے کر کہا۔

"ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا، ہمارے ساتھ" داستان گو بولا۔

"بھئی، ہمارے ساتھ تو اس کے برعکس ہمیشہ ویسا سلوک ہوتا رہا ہے جیسا بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں" دت نے کہا۔

"دیکھا؟" لیڈر فخر سے بولا "میزبانی اسے کہتے ہیں۔"

"بالکل نہیں کہتے" شاعر بولا "میزبان تو وہ ہوتا ہے جو چق میں سے مہمان کو دیکھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل جائے اور پھر ملازم آ کر کہے کہ جناب، صاحب گھر پر نہیں ہیں۔"

"ہم خود یہی کرتے ہیں" میں نے کہا۔

"سارے شریف آدمی یہی کرتے ہیں" انجینئر بولا۔

"اگر میرے گھر کوئی مہمان رات کے تین بجے آ جائے تو ایمان سے میں تو اُسے قتل کر کے باغیچے میں دفن کر دوں" میں نے کہا۔

"بالکل۔ اور جو تو اُسے قتل نہ کرے اور انٹرٹین کرنا شروع کر دے تو تیری بیوی

www.kmjeenovels.blogspot.com

تجھے قتل کر کے باغیچے میں دفن کر دے" شاعر کی بات پر سب ہنس دیے۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے ؟" میں نے انھیں ڈانٹ پلائی "بالکل ٹھیک کہتا ہے یہ۔ سب نیک بیبیاں ایسا ہی کرتی ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے، ہیڈ ماسٹر کے گھر کوئی نیک بی بی نہیں" دٹ بولا۔

امپاسبل پلیس

اگلی صبح جب میں جاگا، آنکھیں کھولیں، اور اس مرغزار کو دیکھا تو از سر نو میرے شکوک جاگ اٹھے کہ ضرور ہمارے سامنے الف لیلہ کا سوتے جاگتے کا قصہ دہرایا جا رہا ہے۔

"یار، کیا خوبصورت جگہ ہے !" ڈرائیور بولا۔

"ویسے ہونی نہیں چاہیے" میں نے کہا۔

"وہ کیوں ؟" لیڈر بولا۔

"اب تک اس سفر کا جو رنگ رہا ہے، یہ ایپی سوڈ اس سے ہم آہنگ نہیں" میں نے جواب دیا۔

"ہمارا سارا ٹرپ پیٹرن تباہ کر دیا" داستان گو بولا۔

ابھی ہم اس منظر کو اپنے ٹرپ پیٹرن میں فٹ کر رہے تھے کہ چھ نوجوان ہاتھوں میں قابیں اٹھائے پھر سے آموجود ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مدر سے کا وہ لمبا میز پھر سے کھانوں سے لد گیا۔

دٹ زیرِ لب آہ بھر کر بولا "ہائے ! وہ دعوتِ کدو !"

ابھی ہم ناشتا کرنے میں مصروف تھے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب دو افسروں کو ساتھ لے کر آموجود ہوئے۔ ایک انسپکٹر سکولز تھے، دوسرے تحصیل دار تھے۔ لیکن ان کے انداز سے صاف پتا چلتا تھا کہ یا تو انھیں علم ہی نہیں کہ وہ عہدے دار ہیں اور یا پھر

www.kmjeenovels.blogspot.com

چلاس کے عہدے بناسپتی قسم کے ہیں۔

"یار، یہ جگہ تو بالکل امپاسبل قسم کی جگہ ہے" میں نے کہا "اوّل تو اس کا نام ہی بے تکا ہے۔ چلاس۔ کتنا بے ہودہ نام ہے۔ نہ معانی نہ ساؤنڈ ایفکٹ۔ پھر یہاں کی مہمان نوازی کس قدر احمقانہ ہے۔ اور یہاں کے افسر غیر افسرانہ ہیں اور یہاں کے نوجوان لڑکے جو بار بار رقاب اُٹھا کر لاتے ہیں اور رات کے تین بجے مہمانوں کے لیے پلنگ بچھاتے ہیں، اور بات بات پر مسکراتے ہیں، انھیں پتا ہی نہیں کہ نسلِ نو کا برتاؤ کن سانچوں میں ڈھلنا چاہیے۔"

"ایک اور بات بھی تو ہے" شاعر نے کہا "عام طور پر دستور ہے کہ اوپر سے چیز دیدہ زیب اور بھرکیلی ہوتی ہے اور بھیتر سے پھٹیچر۔ یہ شہر جس کا نام چلاس ہے، اُوپر سے پھٹیچر تھا لیکن بھیتر سے مرغزار ہے۔"

"بالکل" ورٹ چلّایا "رات جب ہم نے اِسے اُوپر سے دیکھا تھا تو ایسے لگا تھا جیسے دوسرا الاپچی نالا ہو۔"

ڈپٹی کمشنر

تحصیلدار ہم سے بہت تپاک سے ملا۔ بولا "ڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش ہے کہ چلاس سے روانہ ہونے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے۔"

"ارے!" شاعر نے زیرِ لب کہا "یہاں کا ڈپٹی کمشنر بھی بناسپتی معلوم ہوتا ہے۔"

"بالکل ہے" ورٹ نے کہا "ورنہ ڈپٹی کمشنر کب کسی سے ملتے ہیں۔ دو دو دن باہر دروازے پر بیٹھے انتظار کرو، پھر کہیں ملاقات کا شرف بخشا جاتا ہے۔"

ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ کچہری سے ملحق تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ لیڈر اور داستان گو کہیں کام سے گئے ہیں۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ ان کا انتظار کیا جائے تاکہ سب

www.kmjeenovels.blogspot.com

مل کر اکٹھے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کریں۔

میں کچہری کے لان میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کچہری سے ایک اہل کار باہر نکلا۔ اس نے جھک کر مجھے سلام کیا۔

"ارے!" میں تو حیران رہ گیا۔ کچہری کا اہل کار اور مجھے سلام کرے، اور جھک کر! نہیں، نہیں ضرور اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

چند ساعت کے بعد ایک کلرک باہر نکلا اور اس نے بھی جھک کر مجھے سلام کیا۔ یا اللہ خیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کچہری کا افسر تو خیر پھر بھی سلام کرنے کی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے، مگر کچہری کا کلرک جھک کر سلام کرے! نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اوّل تو میں کچہری کے نام سے ہی خائف ہوں۔ لہٰذا میں نے کبھی ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ لیکن زندگی میں چند ایک بار مجبوراً کچہری جانا پڑا ہے۔ وہاں جا کر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ فرعون مصری تاریخ سے نکل کر، آنکھ بچا کر، ہماری کچہریوں میں آ جمع ہوئے ہیں۔ پہلی مرتبہ جب میں کچہری میں گیا تو ایک گھنٹے کے بعد میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ میں ایک اَن پڑھ نیچ آدمی ہوں جو براہمنوں کے دیس میں آ نکلا ہوں۔ اس کے بعد میں نے خود کو مجرم محسوس کرنا شروع کر دیا، ایسا مجرم جو تختہ دار سے بچا پھرتا ہو۔ جتنی تذلیل میری کچہریوں میں ہوئی ہے کسی اور جگہ نہیں ہوئی۔

دفعتہً مجھے وہ دلخراش باتیں یاد آ گئیں۔ زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ میں ڈٹ کے کھڑا ہو گیا اور بڑی فرعونیت سے کچہری کے عملے کے سلام قبول کرنے لگا۔ اس شغل میں اتنی لذت تھی کہ میرا دل چاہتا تھا کہ زندگی بھر وہاں کھڑا کچہری والوں کے سلام قبول کرتا رہوں۔

ڈپٹی کمشنر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ایک سادہ اور متحمل مزاج آدمی ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے انداز میں ذرا بھڑک نہ تھی۔ یا اللہ! یہ شخص علاقے کا نظم و نسق

www.kmjeenovels.blogspot.com

کیسے چلاتا ہوگا! نہ بوٹ نہ سُوٹ۔ نہ بو، نہ ٹائی۔ نہ فوں فاں، نہ ٹیں ٹاں۔

ڈپٹی کمشنر مقامی آدمی تھا اور سالہا سال سے چلاس میں اس عہدے پر فائز تھا۔

وہ میری حیرت کو تاڑ گیا۔ بولا "میں مقامی آدمی ہوں، اس لیے میں نے اعلان کر رکھا ہے کہ مجھ سے ملاقات پر کوئی پابندی نہیں۔ جب بھی چاہو، مجھ سے آ کر مل سکتے ہو۔" پھر وہ ہنسا۔ کہنے لگا "لوگ مجھ سے آ کر پُوچھتے ہیں، کیا آپ کو وہ سب اختیارات حاصل ہیں جو دوسرے ڈپٹی کمشنروں کو حاصل ہیں۔"

بہرطور چلاس بالکل ہی اَن ہونی جگہ تھی۔ بالکل اُونٹ کی طرح اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ نہ ہیڈ ماسٹر، نہ انسپکٹر آف سکولز، نہ طلبا، نہ کچہری، نہ ڈپٹی کمشنر۔

جیپ میں گلگت کی طرف جاتے ہُوئے میں انھی سوچوں میں کھویا ہُوا تھا۔